# قدسیہ زیدی

مرتب
بشیر حسین زیدی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

# قدسیہ زیدی

مرتب

بشیر حسین زیدی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

**Qudsia Zaidi**
Edited by
Bashir Husain Zaidi
Rs. 71/-

## صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025 011-26987295
**Email: monthlykitabnuma@gmail.com**

## شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔110006 011-23260668
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، ممبئی۔400003 022-23774857
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔202002 0571-2706142
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بھوپال گراؤنڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025 011-26987295

قومی اردو کونسل کی کتابیں مذکورہ شاخوں پر دستیاب ہیں

سنہ اشاعت: 2013 تعداد: 1100 قیمت: -/71 روپے
ISBN :978-81-7587-936-2 سلسلۂ مطبوعات: 1718

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔110025
فون نمبر: 49539000 فیکس: 49539099
ای میل: urducouncil@gmail.com ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: لاہوتی پرنٹ ایڈز، جامع مسجد دہلی۔110006
اس کتاب کی چھپائی میں 70 GSM TNPL Maplitho کاغذ کا استعمال کیا گیا ہے۔

# چند معروضات

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ایک قدیم اشاعتی ادارہ ہے، جس نے معتبر ادیبوں کی سینکڑوں کتابیں شائع کی ہیں اور اپنے ماضی کی شاندار روایات کے ساتھ آج بھی سرگرم عمل ہے۔ مکتبہ کے اشاعتی کاموں کا سلسلہ ۱۹۲۲ء میں اس کے قیام کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا جو زمانے کے سرد و گرم سے گزرتا ہوا اپنی منزل کی طرف گامزن رہا۔ درمیان میں کئی دشواریاں حائل ہوئیں۔ نامساعد حالات نے سمت و رفتار میں خلل ڈالنے کی کوشش بھی کی مگر نہ اس کے پائے استقلال میں لغزش ہوئی اور نہ عزم سفر ماند پڑا، چنانچہ اشاعتوں کا تسلسل کلی طور پر کبھی منقطع نہیں ہوا۔

مکتبہ نے خلاق ذہنوں کی اہم تصنیفات کے علاوہ طلبا کی نصابی ضرورت کے مطابق درسی کتب بھی شائع کیں اور بچوں کے لیے کم قیمت میں دستیاب ہونے والی دل چسپ اور مفید کتابیں بھی تیار کیں۔ ''معیاری سیریز'' کے عنوان سے مختصر مگر جامع کتابوں کی اشاعت کا منصوبہ بنایا اور اسے عملی جامہ پہنایا اور یہی عمل اس کا نصب العین قرار پایا۔ مکتبہ کا یہ منصوبہ بہت کامیاب رہا اور مقبول خاص و عام ہوا۔ آج بھی اہل علم و دانش اور طلبا مکتبہ کی مطبوعات سے تعلق خاطر رکھتے ہیں۔ درس گاہوں اور جامعات میں مکتبہ کی مطبوعات کو بہ نظرِ استحسان دیکھا اور یاد کیا جاتا ہے۔

ادھر چند برسوں سے اشاعتی پروگرام میں کچھ تعطل پیدا ہو گیا تھا جس کے سبب فہرست کتب کی اشاعت بھی ملتوی ہوتی رہی مگر اب برف پگھلی ہے اور مکتبہ کی جو کتابیں کم یاب بلکہ نایاب ہوتی جارہی تھیں ان میں سے دو سو ٹائٹل قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے شائع ہو چکے ہیں اور ان سے زیادہ قطار میں ہیں (اسی دوران بچوں سے تعلق رکھنے والی تقریباً سو کتابیں مکتبہ نے بلاشرکتِ غیرے شائع کی ہیں)۔ زیرِ نظر کتاب مکتبہ جامعہ اور قومی کونسل کے مشترکہ اشاعتی سلسلے کی ہی ایک کڑی ہے۔

مکتبہ کے اشاعتی پروگرام کے جمود کو توڑنے اور اس کی ناؤ کو بھنور سے نکالنے میں مکتبہ جامعہ کے بورڈ آف ڈائرکٹرس کے چیرمین محترم جناب نجیب جنگ صاحب (آئی اے ایس) وائس چانسلر، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے جس خصوصی دلچسپی کا مظاہرہ کیا ہے وہ یقیناً لائق ستائش اور ناقابلِ فراموش ہے۔ مکتبہ جامعہ ان کا ممنون احسان رہے گا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ارباب حل وعقد کا شکریہ بھی ہم پر لازم ہے جن کے پُر خلوص تعاون کے بغیر یہ اشتراک ممکن نہ تھا۔ اوّلین مطبوعات میں کونسل کے سابق ڈائرکٹر کے تعاون کا کھلے دل سے اعتراف کیا جا چکا ہے۔ مکتبہ کی باقی کتابیں کونسل کے موجودہ فعال ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین صاحب کی خصوصی توجہ اور سرگرم عملی تعاون سے شائع ہو رہی ہیں، جس کے لیے ہم ان کے اور کونسل کے وائس چیرمین پروفیسر وسیم بریلوی صاحب کے ممنون ہیں اور تہ دل سے ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ امید کرتے ہیں کہ مکتبہ کو ہمیشہ ان مخلصین کی سرپرستی حاصل رہے گی۔

خالد محمود
منیجنگ ڈائرکٹر
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

# فہرست

# ایک خط

ابھی ابھی جمشید پور سے لوٹا تو فرید صاحب کا تار ملا کہ قدسیہ زیدی بھی ساتھ چھوڑ گئیں۔ کیا لکھوں آپ کو اور کیسے لکھوں اس دس منٹ میں جو خبر پا کر گزری، نہ جانے کیا کیا آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ نہ جانے کب تک کیا کیا یاد آتا رہے گا۔ مگر وہ تو چلی گئیں۔ اب دیکھیں کب ملاقات ہو۔ آپ پر جو گزر گئی اور گزر رہی ہوگی اس کا اندازہ کون لگا سکے گا۔ جانتا ہوں کہ آپ کے صبر کی خو اور راضی برضا رہنے کا مسلک اس ابتلائے عظیم میں بھی آپ کا ساتھ دیں گے مگر جی کی بستی تو سونی ہو ہی گئی۔

شمع، سید اور بلال اپنی اپنی جگہ تڑپ رہے ہوں گے۔ ابھی دو دن ہوئے شمع کا خط آیا تھا۔ اسی وقت جواب لکھا۔ اب اسے کیا لکھوں؟ اور اس وقت آپ کو بھی اور کیا لکھوں۔ جس نے یہ غم کا پہاڑ آپ پر توڑا ہے وہی اس کو اٹھانے کی طاقت بھی عطا فرمائے۔

آپ کا شریکِ غم بھائی

ذاکر

(ڈاکٹر ذاکر حسین خاں)

# قدسیہ

مالک رام

کرنیل سید بشیر حسین زیدی ابھی علی گڑھ اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے کہ اُن کی نسبت آنریبل خواجہ غلام الثقلین مرحوم کی منجھلی صاحبزادی سیدہ خاتون سے ٹھہر گئی۔ سیدہ خاتون صورت و سیرت ـــــ ہر لحاظ سے اپنے اقران و اماثل میں ممتاز اور ہر دلعزیز شخصیت کی مالک تھیں۔ لیکن "نوش درخشید ولے دولتِ مستعجل بود" کے مصداق عین عنفوانِ شباب میں ان کا اچانک ۹ جون ۱۹۲۹ء کو انتقال ہو گیا۔ موت کسی حالت میں بھی ہو، دائمی جدائی کا پیش خیمہ ہونے کے باعث افسوسناک ہے، لیکن جوانا مرگی تو بسا اوقات ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے۔

مرحومہ کے بڑے بھائی خواجہ غلام السیدین کے لیے یہ سانحہ ماتم سخت ثابت ہوا، اور ان کی صحت پر اس کا بہت ناخوشگوار اثر پڑا۔ خود زیدی صاحب کے رنج و قلق کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ آخر ان لوگوں نے فیصلہ کیا کہ غم غلط کرنے کے لیے سیر و سیاحت کی جائے۔ سیدین کے چچا خواجہ غلام السبطین بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے، اور یوں یہ مختصر قافلہ جولائی ۱۹۲۹ میں خشکی کے راستے (کوئٹہ، وزداب وغیرہ سے ہوتے ہوئے) ایران کے سفر پر روانہ ہو گیا۔

ایران بھر میں گھوم پھر کر یہ لوگ جب تہران پہنچے، تو یہاں زیدی صاحب بیمار ہو گئے۔ ان کے کان میں پیپ پیدا ہو گئی، جس سے شدید بخار آنے لگا۔ اس حالت میں ان

کے لیے سفر خطرے سے خالی نہیں تھا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ خواجہ غلام السبطین ہندستان واپس آجائیں کیونکہ طبیہ کالج سے، جہاں وہ بحیثیت سکتر ملازم تھے، ان کی رخصت کی میعاد ختم ہونے والی تھی۔ سیدین البتہ تیمارداری کے لیے زیدی صاحب کے ساتھ تہران میں رک گئے۔ بارے، کان پر عمل جراحی اور علاج معالجے کے بعد زیدی صاحب سفر کے قابل ہو گئے۔ بالآخر عراق کے مقاماتِ مقدسہ کی زیارات کرتے ہوئے یہ دونوں بحری جہاز سے اکتوبر ۱۹۲۹ء میں ہندستان واپس پہنچے۔

سفر کا فوری مقصد تو پورا ہو گیا کہ مختلف شہروں کے سیر سپاٹے اور مذہبی مقامات کی زیارت نے زخم کو مندمل ہونے کا موقع فراہم کر دیا۔ لیکن اس کی کسک کا کلیتہ زائل ہو جانا کیونکر ممکن تھا! زیدی صاحب نے فیصلہ کر لیا کہ اب شادی نہیں کریں گے اور مجرد زندگی بسر کریں گے۔

ان کے اس فیصلے کی سب سے زیادہ مخالفت قدرتاً ان کی والدہ نے کی۔ اوائل میں تو انھوں نے مصلحتاً دخل نہ دیا، لیکن کچھ مدت گزر جانے کے بعد بلطائف الحیل سلسلہ جنبانی کی۔ انھوں نے زیدی صاحب سے پوچھا: بیٹا، آخر تم کیسی بیوی چاہتے ہو؟ زیدی صاحب نے جواب دیا: اماں، بیوی ایسی ہو، جو ہمارے گاؤں ککرولی میں باورچی خانے میں بیٹھ کر کھانا بھی پکا سکے، اور اگر کبھی مجھے وائسرائے ہند کی ملاقات کو وائسریگل لاج جانا پڑے، تو اس ماحول میں بھی وہ نہ صرف خوش اسلوبی سے اپنا رول ادا کر سکے، بلکہ اس کے لیے کما حقہ، موزوں ثابت ہو۔ اس طرح بات ہنسی مذاق میں ختم ہو گئی۔

علی گڑھ اسکول کی ہیڈ ماسٹری سے سبکدوش ہونے کے بعد زیدی صاحب ۱۹۳۰ء میں ریاست رامپور کی ملازمت میں شامل ہو گئے۔ ہوا یہ کہ جون ۱۹۳۰ء میں نواب حامد علی خان کا انتقال ہو گیا، اور ان کی جگہ ان کے بڑے صاحبزادے رضا علی خان، وسادہ آرائے رامپور ہوئے۔ نواب حامد علیخان مرحوم نے زیدی صاحب کے خاندان سے کچھ دور نزدیک کی رشتہ داری کا سلسلہ ڈھونڈ نکالا تھا، جس سے وہ زیدی صاحب کو اپنا بھانجا کہتے تھے۔ یہ ان مرحوم کے عہدِ حکومت میں کبھی کبھی رامپور جاتے آتے رہے

تھے۔ رضا علی خان اس زمانے میں ولی عہد تھے۔ چونکہ یہ دونوں ہمعمر تھے، اس لیے زیدی صاحب کے ان سے دوستانہ مراسم قائم ہو گئے، اور یوں آپس میں خاصی یگانگت اور بےتکلفی پیدا ہو گئی۔

جب جون ۱۹۳۰ میں رضا علی خان گدّی پر بیٹھے، تو انھوں نے تار دے کر زیدی صاحب کو علی گڑھ سے بلوا بھیجا۔ یہ رامپور پہنچے، تو انھوں نے ان کو ریاست کے ہائی کورٹ کا جج مقرر کر دیا۔ بتدریج ۱۹۳۶ء میں یہ ریاست کے چیف منسٹر کے عہدے پر فائز ہو گئے۔

زیدی صاحب ہنوز مجرّد تھے۔ یہاں دلّی میں دو خاندان ایسے تھے، جن سے اُن کے بہت قرب اور دوستی کے تعلقات تھے۔ اوّل، مشہور کانگریسی کارکن رگھونندن سرن؛ اور دوسرے آصف علی بیرسٹر۔ رگھونندن سرن کے ساتھ بچپن کا یارانہ تھا؛ دونوں اسکول اور سان اسٹیفنس میں ہم جماعت اور بعد کو کیمبرج میں بھی ایک ساتھ رہے تھے۔ آصف علی عمر میں ان سے بڑے تھے۔ آصف علی کا رگھونندن سرن کے والد لالہ پیارے لال سے بہت دوستانہ تھا اور وہ اکثر ان کے گھر آتے جاتے رہتے تھے۔ وہیں زیدی صاحب کی ان سے ملاقات ہوئی، اور عمر کے تفاوت کے باوجود وہ ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے اور بعد کے زمانے میں بھی دید و وادید کے باعث ان مراسم میں کوئی کمی نہیں آئی۔

آصف علی صاحب کی بیگم ارونا (آصف علی) نے طے کیا کہ جس طرح بھی ہو، زیدی صاحب کی شادی کرائی جائے۔ یہ وہ زمانہ ہے، جب آل انڈیا ریڈیو اپنے ابتدائی دور میں تھا۔ مسٹر لائنیل فیلڈن اس کے کنٹرولر جنرل تھے اور سیّد احمد شاہ بخاری "پطرس" دلّی کے اسٹیشن ڈائرکٹر۔ ارونا آصف علی کا پطرس کے وہاں جانا آنا ہو گیا۔ پطرس کے ساتھ ان کی چھوٹی سالی قدسیہ بھی رہتی تھیں۔ ارونا نے انھیں دیکھا، تو انھیں خیال گزرا کہ یہ زیدی صاحب کے لیے بہت موزوں رشتہ ہو گا۔ انھوں نے اس کا آصف علی صاحب سے ذکر کیا؛ انھوں نے بھی اس انتخاب پر صاد کر دیا۔

اب ارونا نے مسکوٹ کی۔ اگلی مرتبہ زیدی صاحب دلّی آئے، تو انھوں نے اُن سے

قدسیہ کا ذکر کیا۔ سوال یہ تھا کہ زیدی صاحب انھیں دیکھیں کیونکر۔ زیدی صاحب بمبئی جا رہے تھے۔ ارونا نے تجویز پیش کی کہ واپسی میں یہ آگرے اتر جائیں؛ آصف علی صاحب اور ارونا بھی، بخاری خاندان سمیت سیر کے لیے وہاں پہنچ جائینگے۔ قدرتاً قدسیہ بھی ان کے ساتھ ہونگی۔ یوں زیدی صاحب کو انھیں دیکھنے کا موقع مل جائیگا۔ اگر یہ ابتدائی مرحلہ اطمینان بخش طور پر طے ہو گیا تو اگلے مسائل بآسانی خوش اسلوبی سے حل کیے جا سکتے ہیں۔ زیدی صاحب نے یہ تجویز منظور کر لی اس پر آصف علی صاحب نے پطرس کو آگرے کی سیر کی دعوت دی۔ جسے پطرس نے قبول کر لیا قصۂ کوتاہ، سارا پروگرام حسبِ قرار داد تکمیل کو پہنچا۔ زیدی صاحب نے قدسیہ کو پسند کیا اور ان سے نکاح پر اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔

زیدی صاحب کے اگلی مرتبہ دلّی آنے پر آصف علی صاحب نے پطرس خاندان کو کھانے پر بلایا۔ اور ان سے ان کا باقاعدہ تعارف کرایا۔ اور اس کے بعد ان کی طرف سے قدسیہ کا پیغام دے دیا۔

لیکن یہ داستان جاری رکھنے سے پہلے ضروری ہے کہ قدسیہ کے خاندان کا مختصر تعارف کرا دیا جائے۔

ہماری جنگِ آزادی میں دہشت پسند تحریک کا حصّہ کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہم اسے پسند کریں یا نہیں، اس سے انکار ممکن نہیں کہ ان لوگوں نے جو کچھ کیا، اپنے ملک کی خدمت اور اسے غیر ملکی تسلّط سے آزاد کرانے کی خاطر کیا۔ انھیں خوب معلوم تھا کہ اگر گرفتار ہو گئے تو تختۂ دار سے ادھر کوئی ٹھکانا نہیں۔ حصولِ مقصد کی خاطر یوں بڑی سے بڑی قربانی کے لیے آمادہ ہو جانا معمولی بات نہیں۔

دسمبر ۱۹۱۲ء میں وائسرائے لارڈ ہارڈنگ دلّی آئے۔ ۲۲ر دسمبر کو ان کا جلوس چاندنی چوک سے نکلا۔ وہ صبح گیارہ بجے دلّی ریلوے اسٹیشن پر اترے اور جلوس ہاتھیوں پر ملکہ کے باغ سے ہوتا ہوا ٹاؤن ہال کے قریب چاندنی چوک میں داخل ہوا۔ پروگرام یہ تھا کہ وہاں سے جلوس لال قلعے کے لاہوری دروازے سے داخل ہو کر نوبت خانے پہنچیگا، جہاں وائسرائے حاضرین اور عمائدِ شہر سے خطاب کرینگے۔

جلوس چاندنی چوک میں بمشکل چند ہی قدم گیا ہوگا کہ جنوبی صف میں (پرانے) پنجاب نیشنل بنک کی عمارت کے اوپر سے کسی نے وائسرائے کے ہاتھی پر بم پھینکا۔ اس کے ٹکڑے لارڈ ہارڈنگ کے سیدھے شانے کی پچھلی طرف سے گھس کر اوپر کی طرف نکل گئے، گردن پر بھی زخم آیا۔ ان کے ساتھ ان کی بیگم بھی ہودے میں بیٹھی تھیں، وہ بچ گئیں؛ خدا کی شان، ان کے خراش تک نہیں آئی۔ ہودے کے پیچھے ریاست بلرام پور کے نیپال کا رہنے والا ایک ہندستانی ملازم چھا بیر کھڑا تھا؛ اصلی نشانہ وہ ثابت ہوا، اس کے پرخچے اڑ گئے۔ ایک اور ملازم بھی خاصا زخمی ہوا۔ (بقیہ تفاصیل غیر ضروری ہیں)

حادثے کی اہمیت سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ شہنشاہ ہند کا نمائندہ، اور اس پر راجدھانی میں یوں دن دہاڑے قاتلانہ حملہ! دلّی سے لندن تک ایوانِ حکومت میں زلزلہ آگیا۔

اس زمانے میں مالکم ہیلی دلّی میں چیف کمشنر تھے؛ اور حکومتِ ہند کے محکمۂ خفیہ پولیس کے افسرِ اعلیٰ سر چارلس کلیولینڈ۔ اگرچہ حکومتِ ہند بھی اس سارے قضیے کی تحقیق میں پورے طور پر سرگرم رہی، لیکن اپنے منصب کے باعث حادثے کی چھان بین اور سازش کی کھوج کی اصلی ذمہ داری انھیں دونوں کے سپرد ہوئی۔ جن اصحاب نے اس عہد کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے، وہ خوب جانتے ہیں کہ کس درجے کے محنتی اور مستقل مزاج، ہوشیار اور زیرک، حاضر دماغ اور معاملہ رس افسر تھے چنانچہ دونوں اس حادثے کی گتھی سلجھانے میں جٹ گئے۔

سر چارلس کلیولینڈ کے ماتحت ایک جواں سال انسپکٹر تھے، عبداللہ نام، جو اپنی ذہانت اور معاملہ فہمی کے لیے مشہور تھے۔ کلیولینڈ نے تحقیق و تفتیش کا کام ان کے سپرد کیا۔ انھوں نے بھی اپنی کارکردگی سے اپنے آپ کو اس اعتماد کے قابل ثابت کر دیا، اور دن رات ایک کر کے مقدمے کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

اس اہم مقدمے میں عبداللہ صاحب نے جس مستعدی اور فرض شناسی کا مظاہرہ کیا، اس کے صلے میں انھیں بعد کو خطاب "خان بہادر" عطا ہوا اور ترقی دے کر سپرنٹنڈنٹ بنا دیا گیا۔ اسی زمانے میں زیدی صاحب کے والد سید شوکت حسین بھی دلّی میں محکمۂ پولیس

ہیں انسپکٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ سید شوکت حسین اور سید عبداللہ صاحب ہم پیشہ ہونے کے باعث ایک دوسرے کو جانتے اور بہت حد تک رفیقِ کار تھے۔

قدسیہ انھیں خان بہادر عبداللہ صاحب کی چھوٹی صاحبزادی تھیں۔ ہماری زبان کے مشہور مزاح نگار پروفیسر سید احمد شاہ بخاری پطرس کی بیگم زبیدہ ان کی بڑی بہن تھیں۔ عبداللہ صاحب دراصل کشمیری برہمنوں کی گوت وانچو کے چشم و چراغ تھے۔ دو تین پشت اوپر ان کے کسی بزرگ نے اسلام قبول کر لیا تھا؛ پھر یہ خاندان اپنے مسقط الرأس سے ہجرت کر کے لاہور آ بسا۔ ان کی اولاد میں ایک بیٹا اور چار بیٹیاں ہوئیں۔ بیٹا جوانی میں فوت ہو گیا۔ چاروں بیٹیوں کی اولاد بحمدہٖ موجود ہے۔

قدسیہ ۲۳ دسمبر ۱۹۱۴ء کو دلّی میں پیدا ہوئیں، جہاں ان دنوں ان کے والد عبداللہ صاحب بسلسلۂ ملازمت مقیم تھے۔ ان کا اصلی نام امۃ القدوس تھا۔ جب یہ کالج میں پہنچیں تو نام کی طوالت کے باعث اساتذہ اور طلبا سب انھیں سہولت کی وجہ سے "اُمّل" کہہ کر پکارنے لگے؛ لہٰذا انھوں نے اپنا نام بدل کر قدسیہ کر لیا۔

قدسیہ دو ڈھائی سال کی تھیں کہ ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا؛ اور آٹھ نو برس بعد خان بہادر عبداللہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اس کے بعد قدسیہ اپنی بڑی ہمشیرہ زبیدہ اور ان کے شوہر سید احمد شاہ بخاری پطرس کے ساتھ رہنے لگیں۔ پطرس ان کی پھوپھی کے بیٹے بھی تھے یعنی عبداللہ مرحوم کی ایک بہن پطرس کے والد سید اسداللہ شاہ بخاری کے عقدِ نکاح میں تھیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی تعلیم لاہور میں ہوئی۔ وہ خواتین کے کنیرڈ کالج کی طالبہ تھیں؛ جہاں سے انھوں نے بی اے کا امتحان پاس کیا۔

جب آصف علی صاحب نے پیغام دیا، تو پطرس کے خاندان کے بعض حلقوں کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہوئی۔ اگرچہ کچھ لوگوں نے زیدی صاحب کے غیر کشمیری ہونے پر بھی اعتراض کیا، لیکن مخالفت کا اصلی سبب ان کا شیعی ہونا تھا۔ قدسیہ اور پطرس دونوں کے خاندان کٹر اہلسنّت والجماعت کے مسلک کے پیرو تھے، بلکہ پطرس کے والد سید اسداللہ شاہ بخاری تو اپنے علاقے کے خاصے مشہور پیر تھے اور ان کے مریدوں کی

بہت بڑی تعداد تھی۔ جب مخالفت ہوئی، تو قدسیہ کی بڑی بہن زبیدہ آڑے آئیں۔ زبیدہ بڑی روشن ضمیر (Clairavoyant) تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں رویائے صادقہ اور کشف کی نعمتوں سے نوازا تھا۔ خاندان کے علاوہ باہر کے بے تکلف ملنے والے بھی ان کی اس خصوصیت سے خوب واقف تھے۔ وہ اڑ گئیں کہ قدسیہ کی شادی زیدی صاحب ہی سے ہو گی۔ کیونکہ آپا مرحوم (خان بہادر عبد اللہ) نے خواب میں مجھ سے قدسیہ کے ہونے والے شوہر کے جو کوائف اور خصوصیات بیان کی تھیں، وہ سب زیدی صاحب میں موجود ہیں۔ غرض، زبیدہ کی ضد کے سامنے سب کو ہتھیار ڈالنا پڑے، اور یہ رشتہ طے ہو گیا۔

نسبت تو ہو گئی، لیکن اب پطرس کسی وجہ سے شادی کی تاریخ مقرر نہیں کرتے۔ آج کل کرتے میں مہینوں گزر گئے۔ بالآخر نواب رضا علی خان (مرحوم) کو مداخلت کرنا پڑی۔ گرمیوں کا زمانہ تھا؛ اور نواب صاحب اپنے گرمائی مستقر مسوری میں مقیم تھے — زیدی صاحب بھی ان کے ساتھ وہیں تھے۔ نواب صاحب نے دلی سے پطرس اور آصف علی اور ارونا آصف علی کو مسوری آنے کی دعوت دی۔ یہ اصحاب گئے، اور یوں شادی کی تاریخ مقرر ہوئی۔

برات ۱۲ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو اسپشل ٹرین سے رامپور سے آئی۔ اس زمانے میں یہاں لے دے کے ایک میڈنز ہوٹل ہی امراء و عمائد کے ٹھہرنے کا مقام تھا؛ وہیں سب لوگ اترے۔ ہوٹل کے بالمقابل انڈر ہل روڈ پر پطرس کے چھوٹے بھائی ذوالفقار علی بخاری رہتے تھے۔ نکاح کی رسم انھیں کے مکان پر ہوئی۔ پچیس ہزار مہر مقرر ہوا۔ پطرس خود ادرنگ زیب روڈ پر الگ مکان میں رہتے تھے۔ دوپہر کا کھانا برات نے وہاں کھایا۔ تین بجے اسپشل ٹرین رامپور کے لیے واپس روانہ ہو گئی؛ اور وہاں پہنچنے پر نواب صاحب نے تین سو مہمانوں کو پُر تکلف ڈنر دیا۔

زیدی صاحب نے مہر میں قدسیہ کو اپنا پرتھوی راج روڈ والا مکان دیا تھا۔ قدسیہ نے بعد کو اسے ۹۳۰۰۰ ہزار میں فروخت کر دیا۔

جن لوگوں نے قدسیہ مرحومہ کو دیکھا ہے، وہ جانتے ہیں کہ ان کی شخصیت کتنی دلآویز اور دلکش تھی؛ واقعی ان میں مقناطیسی تھی۔ جو بھی ان سے ملا یا اُسے کچھ عرصہ ان کے ساتھ کام کرنے کا اتفاق ہوا، ان کا کلمہ پڑھنے لگا۔ اُن کی ذہانت، معاملہ فہمی، وضعداری، ہمدردی، غربا پروری، لوگوں کو آگے بڑھانے کا جذبہ۔ غرض کس کس صفت کی تعریف کی جائے۔ زیدی صاحب ریاست رامپور کے چیف منسٹر تھے اور بلا مبالغہ صحیح معنوں میں ریاست کے سیاہ و سپید کے مالک۔ انھوں نے اپنے دورِ اقتدار میں وہاں متعدد اصلاحات نافذ کیں، عوام کی مادی اور معنوی ترقی کے سامان مہیا کیے، ریاست رامپور کو شاہراہِ ترقی پر ڈال دیا۔ اور اسے ہندستان کے صنعتی نقشے پر نمایاں مقام دلانے میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ یہ سب بجا اور درست: بلکہ غالباً اصلیت اس سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ لیکن کون بتا سکتا ہے کہ ان کی کامیابی اور کامرانی میں قدسیہ مرحومہ کا کتنا ہاتھ تھا! انھوں نے زیدی صاحب کو ان کے فرائضِ منصبی کے علاوہ تمام جھمیلوں سے آزاد کر دیا۔ نہ صرف ان کی سرگرمیاں میں کبھی حائل نہ ہوئیں، بلکہ انھیں ہر میدان میں پورا تعاون پیش کیا۔ زیدی صاحب نے کبھی اپنی والدہ سے بیوی کی جو صفات بیان کی تھیں، وہ ان کا صحیح مصداق ثابت ہوئیں۔ انھوں نے واقعی ککرولی میں ان کے باورچی خانے میں بیٹھ کے کھانا بھی پکایا، اور ان کے ساتھ وائسرائے کے درباروں میں بھی اس شان سے شریک ہوئیں کہ سب نے اس کی داد دی۔

ان کے کردار کا ایک اور پہلو دیکھیے:

زیدی صاحب کا یہ دستور تھا کہ عشرۂ ثانی کی مجالس میں شرکت کے لیے اپنے وطن ککرولی چلے جاتے تھے۔ اس دوران میں وہاں ہر روز مجلس منعقد ہوتی تھی۔ ان ایام میں وہاں کے باشندوں کے ذاتی مسائل بھی سنتے اور حتی الوسع ان کا مداوا کرتے۔ اہلِ قصبہ کے لیے اربعین کی مجالس اور ان کی آمد گویا لازم و ملزوم ہو گئی تھیں۔ لیکن آخر یہ ملازم ریاست تھے اور اس کے بڑے ذمہ دار عہدے پر فائز۔ ایک آدھ مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ اہم معاملات یا وقتی مصروفیات کے باعث یہ رامپور سے نکل نہ سکے۔ ان مواقع پر

قدسیہ نے برضا و رغبت ان کی قائم مقامی کا فرض ادا کیا، بلکہ وہ خود اپنی خواہش اور خوشی سے ٹکر دلی گئیں، وہاں مجلسیں کرائیں، اور تمام رسوم اسی طرح سے ادا کی گئیں، جیسے زیدی صاحب کی موجودگی میں ہوتی تھیں۔ یاد رہے کہ ان کی تعلیم و تربیت بالکل دوسرے ماحول میں، اہل تسنن کے طریقے پر ہوئی تھی۔ اگر وہ یہ نہ کرتیں، تو کوئی شخص اُن پر حرف گیری نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے یہ کیا۔

بات دراصل یہ تھی کہ ان کی وفا شعاری اور فرض شناسی یہ بات برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ زیدی صاحب کے معمولات دینی و دنیوی میں کسی عنوان کمی آئے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ آخر آن کے نصف بہتر ہونے کی حیثیت میں ان کا فرض تھا کہ وہ ان کا ہر حال میں ہاتھ بٹائیں۔ جہاں من و تو کا امتیاز درمیان سے اٹھ جاتے، وہاں ملتیں مٹ کر اجزائے ایماں ہو جاتی ہیں۔ ایک اور کشش بھی ضرور رہی ہوگی کہ ٹکر دلی جانے میں ان کی خدمت خلق کی بنیادی خواہش کے پورا ہونے کے مواقع بہت زیادہ تھے۔

۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوا اور اس کے ساتھ ہی بدقسمتی سے قتل و غارت کا بازار گرم ہو گیا۔ رامپور کے چار پانچ ہزار آدمی دلی میں مختلف حیثیتوں سے کام کرتے تھے۔ اور یہاں فرقہ وارانہ فسادات اپنے پورے شباب پر تھے۔ رامپور میں ان کے لواحقین نے فریاد کی کہ ریاست ان کے بچانے کا انتظام کرے۔ یہی وہ لوگ تھے، جنھوں نے اس سے چند ہفتے پیشتر پاکستانی پروپگنڈے کی بنا پر رامپور میں حکومت کے خلاف بلوہ کر دیا تھا؛ زیدی صاحب کے اعزہ و اقارب کے گھر بار لوٹ لیے تھے اور خود ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا۔ کوئی اور ہوتا، تو ان سے پوچھتا کہ اب کس منھ سے یہ درخواست لے کر آئے ہو؛ کل تک تو تم مجھے اپنا جانی دشمن خیال کرتے تھے، آج میں تمھارے عزیزوں کا محافظ اور نجات دہندہ کیونکر بن گیا؟ لیکن زیدی صاحب نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ ریاست کا چیف منسٹر ہونے کے باعث ریاست کے باشندوں کے جان و مال اور عزت و ناموس کی حفاظت ان کا فرض تھا۔ رعایا حکمران کی اولاد کا درجہ رکھتی ہے۔ اولاد ناخلف ہو سکتی ہے، لیکن اس سے والدین کی محبت یا پدری جذبات

میں کی واقع نہیں ہو جاتی۔ زیدی صاحب نے بھی واقعات کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھا۔
زیدی صاحب نے حکومتِ ہند کی منظوری اور تصدیق سے فیصلہ کیا کہ ایک اسپیشل ٹرین
رامپور سے دلی آئے اور رامپور کے جملہ باشندوں کو یہاں سے نکال لے جائے۔ دلی
میں اس وقت فساد کی آگ پوری شدت سے بھڑک رہی تھی۔ ایسے میں کسی مسلمان کا باہر
سے یہاں آنا، اور وہ بھی مسلمانوں کی مدد کے لیے، اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کس حد تک
پُرخطر تھا؛ یہ گویا شیر کے بھٹ میں گھسنے کے مرادف تھا۔ لیکن زیدی صاحب نے خطرے کی
پروا نہ کی اور ٹرین لے کر اس مہم پر روانہ ہوگئے۔ قدسیہ نے پوچھا کہ آپ یہ کیا کر رہے
ہیں؟ اور کن لوگوں کے لیے؟ زیدی صاحب نے جواب دیا کہ میں ان لوگوں کے گذشتہ اعمال
کا انتقام لینا چاہتا ہوں۔ قدسیہ نے کہا: انتقام! یہ اچھا انتقام ہے! زیدی صاحب
نے اس پر کہا تو یہ کہ "ہاں، ایک سیّد اور علی کے نام لیوا کا انتقام ایسا ہی ہونا چاہیے" بلند
آدرش کے نقطۂ نگاہ سے ان کا قول بمثل تھا، لیکن محبت کرنے والی بیوی کی اس سے کیونکر
تسکین ہوسکتی تھی؛ قدسیہ اُمید سے تھیں۔ تاہم کو زیدی صاحب ٹرین لے کر روانہ
ہوگئے۔ اسی شب تشویش کے مارے قدسیہ غریب کے اسقاط ہوگیا۔
چند دن بعد گاڑی رامپوریوں کو لے کر دلی سے رامپور پہنچی۔ سارا شہر اپنے رشتے داروں
اور احباب کے استقبال کے لیے ریلوے اسٹیشن پر موجود تھا۔ وہی لوگ جو کل تک زیدی صاحب
کے دشمن اور مخالف تھے، اور ان کے خلاف اول فول بکنا ان کا شعار تھا، آج اُن پر جان
نچھاور کر رہے تھے اور انھیں اپنا سب سے بڑا محسن اور مسیحا کہتے کہتے اُن کی زبانیں سوکھ
رہی تھیں۔ لاریب، انھوں نے مخالفوں سے انتقام لے لیا تھا۔

اب ایک قابلِ ذکر بات سنیے!

جب یہ واپسی پر نواب صاحب کی خدمت میں سلام کے لیے خاص باغ محل میں حاضر
ہوئے، تو انھوں نے جیب سے ریوالور نکال کر ایڈ۔ ڈی۔ کانگ کے حوالہ کیا کہ اسے بحفاظت
کہیں رکھ دو۔ غیر معمولی تشویشناک حالات اور گوناگون مصروفیات کے باعث وہ بالکل

بھول گئے کہ انھوں نے ریوالور کسی کو دیا ہے۔ دو چار دن بعد انھوں نے دیکھا کہ ریوالور غائب ہے۔ تلاش شروع ہوئی۔ چوری کا شبہہ گزرا؛ اس پر جو ملازم ان کے ذاتی کام کاج پر مامور تھا، پولیس نے اسے حراست میں لے لیا۔ پولیس تو پولیس ہی ہے، اس نے اس غریب پر سختی کی، کچھ مارا پیٹا بھی، اور اسے جیل میں بند کر دیا۔ وہ بےقصور محض بھلا کیسے قبول کر لیتا کہ ریوالور اس نے چرایا ہے!

چار پانچ دن بعد وہ ایڈ۔ ڈی۔ کانگ زیدی صاحب کی خدمت میں ریوالور لیے حاضر ہوا کہ حضور، آپ نے یہ ریوالو، مجھے دیا تھا، حکم فرمایئے کہ میں اسے کیا کروں؟ حقیقت کھلنے پر زیدی صاحب سخت پشیمان اور شرمندہ ہوئے، فوراً ملازم کی رہائی کا حکم دیا۔ قدسیہ نے اصرار کیا کہ ملازم سے معافی مانگیے۔ چنانچہ انھوں نے معافی طلب کی جب یہ ہو چکا، تو کہا کہ اب اسے پچاس روپے انعام میں دیجیے، تاکہ پولیس نے جو اسے ہراساں کیا ہے، اس سے اس کی کچھ اشک شوئی ہو جائے۔ زیدی صاحب نے یہ بھی کیا۔

ابھی انگریز یہیں تھے کہ عبوری حکومت نے دسمبر ۱۹۴۶ء میں دستور ساز اسمبلی کی تشکیل کردی۔ جس کے ذمّے یہ کام تھا کہ آزاد ہندستان کا دستور بنائے۔ زیدی صاحب ریاست رامپور کے نمائندے کی حیثیت سے اس اسمبلی کے رکن مقرر ہوئے؛ غالباً اس کے پہلے مسلمان رکن وہی تھے۔ وہ بدستور ریاست کے چیف منسٹر بھی رہے اور اسمبلی کے رکن بھی، جو عارضی طور پر پارلیمنٹ کا رول بھی ادا کرتی تھی۔ لامحالہ انھیں دونوں جگہ لمبے لمبے عرصے تک قیام کرنا پڑتا تھا۔ قدسیہ بھی ان کے ساتھ یہاں دلّی آنے لگیں۔ وہ یہاں کے حلقوں میں اجنبی نہیں تھیں۔ شادی سے پہلے وہ برسوں پطرس کے خاندان کے فرد کی حیثیت سے یہاں مقیم رہی تھیں۔ یہ گویا پرانے دوستوں سے تجدید ملاقات تھی۔

یکم اگست ۱۹۴۹ء کو ریاست رامپور یوپی میں ضم ہو گئی اور اس کی الگ ہستی ختم کردی گئی۔ ۱۹۵۲ء میں آزاد ہندستان کی پارلیمنٹ کا پہلا انتخاب ہوا۔ زیدی صاحب اس میں کانگرس پارٹی کے امیدوار تھے۔ وہ ہردوئی کے حلقے سے منتخب ہو گئے۔ اور اب ان کا مستقل قیام دلّی میں رہنے لگا۔

پنجاب میں اُردو کی تعلیم عام تھی، اور تصنیف و تالیف کا سارا کام اسی زبان میں ہوتا تھا۔ قدسیہ بارہ برس کی عمر سے پطرس کے گھر میں فردِ خاندان کی طرح رہیں۔ ان کی ساری تعلیم و تربیت بھی انھیں کی نگرانی میں ہوئی۔ گویا سونے پر سہاگہ ہوگیا۔ پطرس کی اردو ادب میں جو حیثیت ہے، وہ کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ان کے زیرِ اثر قدسیہ کو ادب سے جو دلچسپی اور شغف پیدا ہوا ہوگا، اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ رہی سہی کسر دلّی اور رامپور کے قیام نے پوری کردی۔ نہ صرف اس سے ان کی اردو کو جلا نصیب ہوئی، بلکہ دلّی اور لکھنؤ کے محاورے اور روزمرّے سے واقفیت اور اس پر قدرت بھی حاصل ہوگئی۔ گویا ان کے مصنّف بننے کا تمام سامان جمع ہوگیا، صرف مناسب موقع اور تحریک کی ضرورت تھی یہ موقع غیر متوقع طور پر پیش آگیا۔

۳۱ جنوری ۱۹۴۸ء کو رگھونندن سرن کی ہمشیر کی شادی تھی۔ قدرتاً زیدی صاحب اور قدسیہ نے بھی اس میں شرکت کی۔ شام کو یہ لوگ شادی کی رسوم ادا کرنے کے لیے ویدی کے گرد بیٹھے تھے کہ کسی نے آکر چپکے سے رگھونندن سرن کے کان میں گاندھی جی کے قتل کی خبر کہی۔ اور لوگوں پر اس کا کیا اثر ہوا، یہ غیر متعلق ہے۔ نواب صاحب رامپور اور زیدی صاحب پر گاندھی جی کی شہادت کا گہرا اثر ہوا۔ زیدی صاحب نے باپو کے چھوٹے بیٹے دیوداس سے گاندھی جی کی کچھ راکھ حاصل کی، اور اسے ایک اسپیشل ٹرین میں رامپور لے گئے، جہاں یہ پوری عقیدت اور احترام کے ساتھ ایک نمایاں مقام پر دفن کی گئی۔ رامپور واپس پہنچنے پر قدسیہ نے کہا کہ بچوں کے لیے مہاتما جی کی سوانح عمری میں لکھوں گی۔ یہ تھا آغاز ان کے مصنف اور مؤلف اور مترجم بننے کا۔ بعض اوقات کیسے معمولی سی بات کتنے دور رس نتائج کا سبب بن جاتی ہے، جس طرح ایک چھوٹا سا بیج پھٹتا اور درخت کی شکل اختیار کرلیتا ہے!

یوں "گاندھی باباکی کہانی" وجود میں آئی۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اس کا پیش لفظ لکھا۔ اسے اُردو اور انگریزی میں قدسیہ نے خود شائع کیا تھا، ہندی ایڈیشن پنڈت سندر لال نے الٰہ آباد سے شائع کیا۔ حکومتِ ہند نے اس پر قدسیہ کو ایک ہزار روپے کا انعام دیا تھا۔

شنکر کا نام ہندستان کی انگریزی صحافت میں ہمیشہ یادگار رہیگا اُن کا ہفتہ وار اخبار لندن پنچ کا مدِمقابل تھا۔ اس اخبار میں سیاست اور صحافت، متانت اور ظرافت کا ایسا حسین امتزاج ملتا تھا کہ پڑھنے والے بیساختہ اَش اَش کرنے لگتے تھے۔ شنکر نے بچوں میں ادب اور آرٹ کا شوق پیدا کرنے کے لیے ایک سالانہ تصویری مقابلے کا انتظام کیا۔ بچے دور دور سے، ہندستان اور بیرون ہندستان سے، مقابلے میں اپنی تصویریں بھیجتے تھے۔ اس کے علاوہ دلّی میں بچے ایک دن وقتِ مقررہ پر جمع ہو کر سب کی موجودگی میں تصویریں بناتے تھے۔ بعد کو ممتحن اُن کا معاینہ کر کے ان میں سے بہترین تصویر پر انعام کا اعلان کرتے۔ ۱۹۵۸ء میں شنکر نے بچوں کے میلے کا اہتمام کیا، اس میں بچوں کے لیے ڈرامے دکھائے گئے تھے۔ بین الاقوامی بچوں کے فنی مقابلہ کمیٹی کی قدسیہ صدر تھیں۔

قدسیہ مرحومہ کو بچوں سے بہت دلچسپی تھی۔ وہ ہر ایسے کام میں مدد دینے کو ہمیشہ تیار رہتیں، جس کا مقصد بچوں کی دل و دماغ کی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنا ہوتا۔ انھوں نے خود بھی بچوں کے لیے کہانیاں اور ڈرامے لکھے۔ پھر انھیں دلکش انداز میں چھاپنے کا انتظام کیا۔ بلکہ زیدی صاحب نے محض کتابوں کو عمدہ طریقے پر شائع کرنے کی خاطر اپنے دو دوستوں (رگھونندن سرن اور شیو راج بہادر) کے اشتراک سے "کتابی دنیا" کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا۔

پطرس کو شروع سے ڈرامے اور اسٹیج سے بے انتہا شغف رہا۔ جس زمانے میں وہ گورنمنٹ کالج، لاہور میں پروفیسر تھے، انھوں نے وہاں ڈرامیٹک کلب کی سرگرمیوں میں بھرپور حصّہ لیا۔ اس کلب کے زیرِ اہتمام ہونے والے بعض ڈراموں میں انھوں نے خود بھی پارٹ ادا کیا۔ قدرتاً اس سے قدسیہ کو بھی ڈراموں سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ کنیرڈ کالج میں طالبات کی سرگرمیوں میں من جملہ اور باتوں کے ڈرامے کرنا بھی تھا۔ ہمیں معلوم نہیں کہ آیا قدسیہ نے ان میں عملی حصّہ لیا یا نہیں، لیکن وہ ان میں موجود تو ضرور رہی ہونگی؛ غیر شعوری طور پر ان باتوں کا اثر ہونا ناگزیر تھا۔ اس کے بعد پطرس کا آل انڈیا ریڈیو

میں تقرر بھی اس رجحان میں ترقی کا باعث ہوا، اور رامپور کی فضا اور وہاں کے جاگیردارانہ ماحول نے اس کی گویا تکمیل کر دی۔

ان کے اس خوابیدہ شوق کا اوّلین مظاہرہ اس وقت ہوا، جب شنکر نے ۱۹۵۴ء میں بچّوں کے ڈراما میلے کا انعقاد کیا۔ قدسیہ نے اس موقع پر بعض ایسے انگریزی ڈراموں کا ترجمہ کیا، جو جانوروں اور جنگل سے متعلق تھے۔ سیّد امتیاز علی تاج نے جیرم کے جیروم کی بعض مزاحیہ کہانیوں کا ترجمہ چچا چھکّن کے عنوان سے کیا تھا؛ اور اسی رنگ کی چند طبعزاد کہانیاں بھی لکھی تھیں۔ قدسیہ نے ان میں سے بعض کو ڈرامے کی شکل دے دی اور انھیں اسٹیج کیا۔ اور دیوپانی کرشنا سے ان کے لیے تصویریں بنوا کر شائع کر دیا۔

حسنِ اتفاق سے انھیں ایّام میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ان کے اس شوق کو مزید وسعت اور گہرائی دے دی۔

۱۹۵۴ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بعض دوستوں نے ان سے درخواست کی کہ وہ حبیب تنویر کے ڈرامے "آگرہ بازار" کی سرپرستی قبول فرمائیں۔ اس ڈرامے کا "تانا بانا" نظیر اکبرآبادی کی زندگی کے حالات سے بُنا گیا ہے۔ قدسیہ بیگم نے نہ صرف یہ درخواست قبول کر لی بلکہ اجازت دے دی کہ ڈرامے کی ریہرسل ان کے مکان پر کی جائے۔

اس دن سے وہ ڈراما اور اسٹیج کے لیے گویا وقف ہو کے رہ گئیں۔ حبیب تنویر کی آیندہ ترقی بھی انھیں کی مرہونِ منّت ہے۔ انھوں نے خاص وظیفہ دلوا کر ان کے ولایت جانے اور وہاں تعلیم و تربیت حاصل کرنے کا انتظام کیا۔ جب وہاں سے واپس آئے، تو پھر فرانس بھجوا دیا۔ اس کے بعد وہ اپنی کوشش سے روس گئے۔

قدسیہ بیگم نے محسوس کیا ہمارے ہاں نہ ایسے موزوں ڈرامے ہیں جنھیں عوام کی تفریح کے لیے پیش کیا جا سکے، نہ عوامی تھیٹر کا کوئی ایسا تصوّر ہے جس سے ظاہر ہو سکے کہ عام آدمی کیا چاہتا ہے اور اسے کس طرح کی دل بستگی کا سامان پسند ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک ٹھیک ڈراموں کا انتخاب نہ ہو جن کی زبان روزمرّہ کے قریب اور سامع کے فہم اور مذاق کے مطابق ہو؛ اور پھر ان ڈراموں کو کھیلا ایسے طریقے پر جائے

کہ وہ ہمارے معاشرے کی سادہ اور بے تکلف فضا کی عکاسی کر سکے۔ یہ دونوں چیزیں ہمارے ہاں ناپید تھیں: نہ مناسب ڈرامے موجود تھے، نہ موزوں تھیٹر۔

قدسیہ کے دماغ میں کسی خیال کا آنا عمل کی تمہید تھی۔ جب انھیں محسوس ہوا کہ یہ صورتِ حال اصلاح طلب ہے، تو انھوں نے فوراً اس کی اصلاح کی کوشش شروع کر دی۔ انھوں نے خود بعض مغربی مصنفین کے ڈراموں کا اردو میں ترجمہ کیا؛ بعض کو اردو کے قالب میں ڈھالا۔ انھوں نے سنسکرت کے بعض عالمی شہرت رکھنے والے ڈراموں کو بھی اردو میں پیش کیا۔

۱۹۵۵ء میں انھوں نے "ہندستانی تھیٹر" کی تشکیل کی۔ اس کے لیے چند ہم خیال دوستوں کو جمع کیا، ان کے مشوروں سے منڈلی بنائی، اور ڈرامے کرنے لگیں۔ یہاں ایک بات قابلِ ذکر ہے کہ اس اقدام میں انھیں پنڈت جواہر لال نہرو (مرحوم) سے بہت مدد ملی۔ پنڈت جی ان کے ہر کھیل کی پہلی نمایش میں لازماً موجود ہوتے تھے؛ بیگم صاحب تاریخ ان سے مشورہ کرنے کے بعد طے کرتی تھیں۔

اکتوبر ۱۹۵۶ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم نے خرابیِ صحت کی بنا پر علی گڑھ یونیورسٹی کی وائس چانسلری سے استعفا دے دیا۔ اس کے بعد قرعۂ فال زیدی صاحب کے نام پڑا۔ حالات کچھ ایسے تھے کہ زیدی صاحب اس پیشکش کو رد نہیں کر سکتے تھے۔ اور ایمان کی بات یہ ہے کہ ذاکر صاحب کے زمانے میں مسلم یونیورسٹی کے معاملات میں جو قابلِ قدر سدھار ہوا تھا، اور جسے جاری رکھنے کی ضرورت تھی، اس کے لیے زیدی صاحب سے موزوں تر آدمی بھی کوئی نہیں تھا۔ جب زیدی صاحب نے اس کا ذکر قدسیہ سے کیا تو انھوں نے اس کی سخت مخالفت کی۔ ان کی مخالفت کے اسباب دوگونہ تھے۔ اول یہ کہ ۱۹۳۰ء سے زیدی صاحب کی ساری سرگرمیاں سیاسی نوعیت کی رہی تھیں: ۱۹۳۰ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک رامپور میں، اس کے بعد دستور ساز اسمبلی میں؛ اور جب اس کا کام مکمل ہو گیا، تو لوک سبھا کے رکن کی حیثیت سے انھوں نے ملک و ملت کی نمایاں خدمات سرانجام دی تھیں۔ ان سے انھیں ملک کے سیاسی حلقوں میں ناموری اور شہرت بھی حاصل ہوئی، اور عزت و وقار بھی۔ اب اس میدان کو چھوڑ کر ایک

تعلیمی ادارے سے منسلک ہو جانا ان کے نزدیک گویا سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دینے کے مرادف تھا۔ مخالفت کا دوسرا سبب اُن کی ذاتی مصروفیتیں تھیں ۔ وہ نئی دلّی میونسپل کمیٹی کی سرگرم رکن تھیں ۔ وہ شنکر کے ادارے میں بین الاقوامی مقابلۂ مصوری کی صدر تھیں۔ ہندستانی تھیٹر قائم کر چکی تھیں، اور چونکہ ہنوز یہ اپنے ابتدائی مراحل میں تھا، اس لیے اس کے مالی اور انتظامی استحکام کے لیے ان کی متواتر توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اگر ان حالات میں وہ دلّی چھوڑ کر علی گڑھ کا قیام اختیار کر لیتیں، تو یہ سارے کام ختم ہو جاتے ۔ انھوں نے ان منصوبوں کو اپنے خون جگر سے سینچا تھا، اپنے دل و دماغ کی تمام صلاحیتیں انھیں پروان چڑھانے میں صرف کی تھیں ۔ قدسیہ کی نظر میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری اتنی اہم نہیں تھی کہ زیدی صاحب اس کی خاطر اپنی تیس سالہ کمائی کو ملیامیٹ کر دیں ، یا وہ خود اپنی دس سال کی محنت کو خاک میں ملا دیں ۔ اس کے برخلاف زیدی صاحب کے پیش نظر یونیورسٹی کی اہمیت ، اس کے ایک قومی ادارہ ہونے کے باعث تھی ۔ وہ اسے سرسیّد کی یادگار اور اسلامیان ہند کی نئی نسلوں کے خوابوں کی تعبیر خیال کرتے تھے ۔ لیکن دونوں میں سے کوئی بھی دوسرے کو اپنا ہم خیال نہ بنا سکا ۔ آخر کار سمجھوتا اس بات پر ہوا کہ قدسیہ اپنا وقت دلّی اور علی گڑھ کے درمیان تقسیم کرتی رہیں ۔ انھوں نے ویسٹرن کورٹ ، نئی دلی میں کمرہ کرایے پر لے لیا، جہاں سے وہ اپنی مقامی سرگرمیوں میں مصروف رہیں ۔ زیدی صاحب اکیلے علی گڑھ منتقل ہو گئے ۔

ان کے تھیٹر میں اس شغف کو دیکھتے ہوئے انھیں جرمنی سے دعوت ملی کہ آپ برلن آئیے، اور کچھ مدت یہاں رہ کر جرمن تھیٹر کا مطالعہ کیجیے ؛ اس سے آپ کو ہندستانی تھیٹر کے کام کو بڑھانے ، پھیلانے میں مدد ملیگی ۔ انھوں نے یہ دعوت قبول کر لی، اور ۱۹۵۹ء میں جرمنی گئیں ۔ وہاں تقریباً ایک مہینا قیام رہا ۔ واپسی پر یوگوسلاویا بھی گئیں ۔ ہندستان آکر انھوں نے ہندستانی تھیٹر میں کئی اصلاحات کیں، جن سے اس کے کام کا معیار بہت بلند ہو گیا ۔

قدسیہ کے کردار کی یہ نمایاں خصوصیت تھی کہ وہ جو کام ہاتھ میں لیتیں، سرتاپا اس میں غرق ہو جاتیں۔ پھر نہ دن کو دن سمجھتیں، نہ رات کو رات۔ ان پر بس ایک دُھن سوار رہتی کہ یہ کام ٹھیک سے پایۂ تکمیل کو پہنچے۔ اب وہ بالکل ہندستانی تھیٹر کی ہو کے رہ گئی تھیں۔ جن ایام میں کسی ناٹک کی تیاری میں لگی ہوتیں، کھانے پینے تک کا ہوش نہیں رہتا تھا۔ کام کرنے والے لڑکے لڑکیوں کے ساتھ جو کچھ ملا اور جب ملا، کھا لیا۔ رات کو وہ زمین پر سوتی ہیں، تو یہ بھی وہیں ان کے ساتھ زمین پر لیٹی ہیں۔

اب انھوں نے ایک اسکیم بنائی کہ ہندستانی تھیٹر کی منڈلی لے کر ان مراکز کا دورہ کیا جائے جہاں مزدوروں کی بڑی تعداد مقیم ہے۔ اسی سلسلے میں دسمبر ۱۹۶۰ء میں وہ رانچی (بہار) گئیں۔ اس سال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے آل انڈیا ہسٹری کانگریس کو اپنا اجلاس علی گڑھ میں منعقد کرنے کی دعوت دی تھی۔ وزیر تعلیم شریمالی جی نے کانگریس کا ۲۴ دسمبر کو افتتاح کیا۔ زیدی صاحب نے کانگریس کے آخری دن ۲۶ دسمبر کو تمام مندوبین کو ایٹ ہوم پر مدعو کیا۔ انھوں نے قدسیہ کو لکھا کہ کاش کے اس موقع پر تم علی گڑھ میں ہوتیں، لیکن تم منڈلی کے ساتھ رانچی میں ہو، یہ کیونکر ممکن ہے!

قدسیہ نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔ وہ ۲۶ دسمبر کی صبح کو علی گڑھ پہنچ گئیں۔ لیکن جیسا کہ بعد کو ثابت ہوا یہ اتنا زیدی صاحب کی دلی خواہش کو پورا کرنا نہیں تھا، بلکہ انھیں تقدیر کے ساتھ اپنا وعدہ پورا کرنے کے لیے اس دن علی گڑھ پہنچنا تھا۔ وہ شام کی تقریب میں حسبِ معمول سب مہمانوں سے ہنستی بولتی رہیں۔ جن لوگوں کو ان سے ملنے کا موقع ملا ہے، وہ جانتے ہیں کہ وہ اپنی گفتگو، حاضر جوابی، بذلہ سنجی اور باغ و بہار شخصیت سے ہر محفل پر چھا جاتی تھیں۔ یہی اس دن بھی ہوا۔ تین دن کے خشک اجلاسوں کے بعد حاضرین نے شام ہنسی خوشی ان کے ساتھ گزاری۔

اگلی صبح (۲۷ دسمبر) کو اندر سے ملازم نے باہر آکر زیدی صاحب سے کہا کہ بیگم صاحبہ آپ کو بلا رہی ہیں۔ یہ گئے، تو دیکھا کہ بستر پر لیٹی ہیں۔ انھیں دیکھتے ہی ان سے کہا کہ ڈاکٹر کو بلا لیجیے، مجھ پر دل کا دورہ پڑا ہے۔ جب انھوں نے احتجاجاً کچھ کہنا چاہا، تو

بولیں کہ اب باتوں میں وقت ضائع نہ کیجیے، جو میں کہہ رہی ہوں، ویسا کیجیے۔ زیدی صاحب نے فوراً آدمی دوڑائے۔ چند منٹ میں دو تین ڈاکٹر جمع ہو گئے۔ لیکن بے سود، ان کا وقت آن لگا تھا۔ کسی کے کیے کچھ نہ ہو سکا اور وہ آناً فاناً جان بحق ہو گئیں۔ اِنّا لِلّٰہ وَ اِنّا اِلَیہِ راجِعُون۔ وفات کے وقت عمر ۶۴ برس کی تھی۔ غالب کا مصرع اُن پر صادق آتا ہے:

آبگینہ تندیِ صہبا سے پگھلا جائے ہے

حفیظ الرحمٰن خان مجیبی نے تاریخ کہی:

نہاد ہ ام سر تعظیم قدسیہ زیدی ۔ بخاکِ پاک تو تسلیم قدسیہ زیدی
حفیظ خونِ دل از غم رسیدنا مژگاں ۔ حیات و مرگ چہ ترقیم قدسیہ زیدی
صفاتِ ذاتِ مقدس بہ سر زبان جاری ۔ کہ بود احسن تقویم قدسیہ زیدی
سرِ حفیظ کشیدہ بہ فکرِ تاریخش ۔ "سرورِ کوثر و تسنیم قدسیہ زیدی"

(۱۹۶۰ = ۸ - ۱۹۶۸)

یونیورسٹی کے قبرستان میں آسودۂ خوابِ ابدی ہیں۔

وہ مدتوں نئی دلی میونسپل کمیٹی کی رکن رہی تھیں اور اس حیثیت سے انھوں نے اس شہر کی اور اس کے باسیوں کی خدمت کی تھی۔ کمیٹی نے ان کی خدمات کے اعتراف میں اپنا خراجِ عقیدت یوں پیش کیا کہ موتی باغ کی مارکیٹ ان سے منسوب کر دی۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔

## اولاد

۱۔ شادی کے سال بھر بعد پلوٹھی کی لڑکی شمع ۲۵ ستمبر ۱۹۳۸ء کو رامپور میں پیدا ہوئی۔ اسی زمانے میں نواب رضا علی خان مرحوم کی صاحبزادی ناہید بھی پیدا ہوئیں۔ بعض اور ممتاز رامپوری حضرات کے بھی ہم عمر بچے موجود تھے۔ جب یہ بچے تین تین چار چار برس کے ہوئے، تو زیدی صاحب نے ان کی تعلیم و تربیت کے لیے رامپور میں ایک نرسری اسکول قائم کر دیا۔ بعد کو شمع وڈ اسٹاک اسکول، مسوری میں داخل ہو گئی

جہاں سے تعلیم ختم کر کے انھوں نے میرانڈا ہاؤس، دلّی سے بی، اے کیا۔
شمع بچپن سے قدسیہ کے ساتھ ہندستانی تھیٹر جاتی اور وہاں ڈراموں کی ریہرسل دیکھتی تھیں اس سے ان کے دل میں ڈرامے اور اسٹیج کا شوق پیدا ہوا۔ بی، اے کی سند لینے کے بعد یہ رائل اسکول آف ڈراما، لندن میں ڈراما کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے گئیں۔ دو سال وہاں رہ کر انھوں نے ڈگری حاصل کی۔ جس زمانے میں قدسیہ مرحومہ جرمنی گئی ہیں، یہ ہنوز لندن میں تھیں۔ وہاں جرمنی کے ایک مشہور پروڈیوسر نے بیگم صاحب سے کہا کہ جب شمع لندن میں اپنی تعلیم مکمّل کرلیں، تو وہ جرمنی آجائیں اور اس سلسلے کی اعلیٰ تعلیم یہاں حاصل کریں۔ چنانچہ یہ لندن سے برلن پہنچیں اور کوئی سال بھر برلنز فوکز آن سامبلز ( )
میں کام کرتی رہیں۔ یہ برلن ہی میں تھیں کہ قدسیہ کا علی گڑھ میں انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد یہ ہندستان چلی آئیں اور یہاں انھوں نے ہندستانی تھیٹر کا کام سنبھال لیا۔ شادی کے بعد یہ اپنے شوہر مسٹر ستھیو کے ساتھ بمبئی منتقل ہو گئیں، جہاں دونوں میاں بیوی فلم سازی کی صنعت سے وابستہ ہو گئے ہیں۔ انھوں نے بعض معرکے کی فلموں کی ترتیب اور ہدایت کاری میں نمایاں کام کیا ہے، جن میں "گرم ہوا" کو مقام امتیاز حاصل ہے۔ انھوں نے غالب صدی کے موقع پر غالب سے متعلق بیس منٹ کی ایک دستاویزی فلم بھی بنائی تھی۔

۲۔ ۱۹۳۹ء میں بیٹا پیدا ہوا۔ اس کا نام طاہر رکھا گیا تھا۔ وہ ساڑھے تین مہینے بعد والدین کو داغ مفارقت دے گیا۔

۳۔ احمد رضا زیدی (عرف سیّد) ۴ جنوری ۱۹۴۱ء کو رامپور میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم بھی وُڈ اسٹاک اسکول مسوری میں ہوئی، جہاں سے سینیئر کیمبرج کا امتحان پاس کرنے کے بعد انھوں نے سان اسٹیفنس کالج، دلّی میں کیمسٹری (آنرز) میں داخلہ لے لیا بدقسمتی سے امتحان سے چند ماہ پہلے ایک حادثے میں ٹانگ ٹوٹ گئی اور مدّتوں صاحب فراش رہے۔ اس کے باوجود انھوں نے اصرار کیا کہ امتحان میں ضرور بیٹھونگا۔ ناکام تو ہونا ہی تھا۔ اس

پر یہ دل برداشتہ ہوکر امریکا چلے گئے ۔ اول وہاں ایمہرسٹ کالج (میسوچیسٹس) سے بی اے کی سند لی، اس کے بعد نیویارک اسکول آف سوشل ریسرچ سے پی ایچ ڈی کیا (مقالہ آکسفرڈ یونیورسٹی سے چھپنے والا ہے) آج کل دلی یونیورسٹی کے فلاسفی کے شعبے میں مدرس ہیں ۔

۵۔علی رضا زیدی (عرف بلال)۔ زیدی صاحب کے دوسرے صاحبزادے ۲۳ اگست ۱۹۴۹ء کو رامپور میں پیدا ہوئے ۔ انھوں نے بھی وڈاسٹاک اسکول، مسوری سے سینیر کیمبرج کا امتحان درجۂ اوّل میں پاس کرنے کے بعد سان اسٹیفنس کالج، دلّی سے بی اے (تاریخ آنرز) کی سند لی ۔ آج کل جدّہ میں اسٹیٹ ٹریڈنگ کارپوریشن کی سعودی شاخ کے مینیجر ہیں ۔

# ضمیمہ

قدسیہ زیدی کی مطبوعات کی پوری فہرست نہیں ملی ۔ مندرجۂ ذیل کتابیں دستیاب ہوسکیں :

۱۔گاندھی بابا کی کہانی ۔ پیش لفظ از پنڈت جواہر لال نہرو ۔ اس پر حکومت ہند نے انعام دیا تھا ۔ اس کے ترجمے ہندی اور انگریزی میں بھی شائع ہوئے ۔

۲۔آذر کا خواب ۔ برنارڈ شا کے پگمیلین کا ترجمہ

۳۔ خالد کی خالہ ۔ چارلیز آنٹ پر مبنی ڈراما

۴۔ گڑیا گھر ۔ ابسن کے "ڈالز ہاؤس" کا ترجمہ

۵۔ جان پار ۔ ڈراما

۶۔ شکنتلا ۔ کالیداس کے سنسکرت ڈرامے کا ہندستانی میں ترجمہ

۷۔ مٹی کی گاڑی ۔ شودرک کے "مرچھ کٹک" کا ہندستانی ترجمہ

۸۔ مدرا راکشس کا ہندستانی میں ترجمہ

۹۔ سفید کنڈلی ۔ برشٹ کے "کوکیشین چاک سرکل" کا اردو ترجمہ
۱۰۔ امرپلی : مہاتما بدھ کے زمانے کی مشہور داستان
۱۱۔ چچا چھکن کے ڈرامے ۱۲۔ چچا چھکن کے کارنامے

## بچّوں کی کتابیں

۱۔ ان تھک جاں
۲۔ بھن بھن بانو
۳۔ جانباز سپاہی
۴۔ بن کے باسی
۵۔ گلابو چوہیا اور غبارے
۶۔ سرخ جوتے ۔ مغربی بنگال کی اردو اکیڈمی نے اس پر انعام دیا۔
۷۔ بجّو بھیا کی عقلمندی
۸۔ گلابو چوہیا اور پری زاد
۹۔ جنگل میں شیر
۱۰۔ البیلی بچھیا۔ یو پی گورنمنٹ نے انعام دیا۔
۱۱۔ مُنّی کی مانو
۱۲۔ انوکھی دُکان

# قدسیہ زیدی

صالحہ عابد حسین

کلام الٰہی میں پروردگارِ عالم نے فرمایا ہے "ہم نے صورتیں بنائیں اور کیا اچھی صورتیں بنائیں"۔ حقیقت یہ ہے کہ فیاضِ ازل نے جتنی چیزیں خلق کیں ان میں تناسب موزونیت، حسن اور دلکشی کا عجیب امتزاج ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم اپنی کم نگاہی کے باعث اُسے دیکھ سکیں، یا نہ دیکھ سکیں۔ لیکن اس جلوہ گاہِ ناز میں ہر چیز میں اس کے حُسن کا اثر تو موجود ہے۔

میری جا نثار دوست قدسیہ زیدی ان چند بے مثال ہستیوں میں سے ایک تھیں جن کو قدرت اپنی بے پناہ فیاضیوں سے سرفراز کرتی ہے اور جس کی سیرت و صورت دونوں کا حُسن و جمال دلوں کو تسخیر اور آنکھوں کو خیرہ کرتا ہے۔

قدسیہ کے مداحوں اور قدردانوں و چاہنے والوں کی بہت بڑی تعداد ہے لیکن یہ انوکھی بات نہیں۔ لیکن ان کے قریبی دوستوں کا حلقہ بھی بہت وسیع ہے، جو کسی خوش نصیب کے حصے میں آتا ہے۔ آج اُن کے کتنے چاہنے والے یہ محسوس کر رہے ہیں کہ ایک انمول شے ان سے چھن گئی۔

قدسیہ نسلاً کشمیری تھیں اور ان کے تیکھے نقش، ذہین آنکھیں، شفاف موتی کا سا رنگ، کتابی چہرہ اور سیاہ بال، سبھی کشمیری حسن کے غماز تھے لیکن ان کا صاف شستہ لہجہ سن کر کوئی اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ ان کا اصل وطن کشمیر اور وطنِ ثانی

پنجاب ہے جہاں ان کے دادا آکر بس گئے تھے۔ قدسیہ کی پیدائش دلّی کی تھی۔ بچپن یہیں بیتا۔ اعلیٰ تعلیم پنجاب میں پائی۔ شادی کے بعد ایک عرصے تک رامپور میں رہیں اور پھر دلی آن بسایا اور علی گڑھ بھی آتی جاتی رہیں۔ ان کی غیر معمولی شخصیت میں ان سب مقامات کی تہذیب و کلچر کا بڑا خوبصورت امتزاج دیکھا جا سکتا تھا۔

وہ اپنے بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹی تھیں اور اسی لیے باپ کی بہت چہیتی تھیں، ماں کی آغوشِ محبت سے کم سنی میں محروم ہو گئی تھیں۔ لیکن باپ کی محبت اور توجّہ اور بڑی بہنوں کی الفت اور بہنوئی (ڈیلرس) کی شفقت نے انھیں اپنی محرومی اور دکھ کو سہارنے کی قوت بخشی۔ خاندان کی یہ سب سے ذہین بچی سب کی لاڈلی تھی۔ اس لیے باپ نے اعلیٰ تعلیم دلانے کا فیصلہ کیا۔ قدسیہ کو کتابی اور اسکولی تعلیم سے زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ وہ قہقہے لگا لگا کر سنایا کرتیں کہ ہم نے کبھی امتحان تھرڈ کلاس سے زیادہ نمبروں میں پاس ہی کر کے نہ دیا۔

قدسیہ کا دل کتنا دردمند اور حساس تھا، بچپن ہی سے انھیں کتنے صدمے سہارنے پڑے، اسے کم ہی لوگ جانتے تھے۔ ان کے کھنکتے قہقہے، باغ و بہار طبیعت، دلچسپ گفتگو اور پھڑکتے فقرے سن کر کون اندازہ لگا سکتا تھا کہ اس دل میں کتنے داغ ہیں؟ وہ غم کو ایسی دولت سمجھتی تھیں جس میں کسی کو شریک نہیں کیا جاتا

شورشِ باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں
دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

بچپن میں ماں کی جدائی، نوعمری میں باپ کی مفارقت، پھر اکلوتے جوان بھائی کا داغ، شادی کے بعد اپنے پہلے بچے کا غم انھوں نے بڑے حوصلے سے یہ سب صدمے سہارے، مگر دل اتنا حساس اور دردمند تھا کہ ہر کسی کے دکھ اور غم میں تڑپ اٹھتا اور وہ غم زدہ کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتیں۔ قدسیہ کی شخصیت کو نکھارنے میں دردِ دل کی اس دولت کا بڑا حصہ ہے۔

والد کے انتقال کے بعد قدسیہ اپنی بڑی بہن بیگم نجاری کے سایۂ عاطفت میں

آ گئیں۔ بہن سوتیلی تھیں اور احمد شاہ بخاری پطرس پھوپی زاد بھائی، مگر دونوں اُن کو سگی بہن کی طرح چاہتے تھے۔ پطرس کی غیر معمولی ذہانت اور ظرافت سے کون ادبی ذوق رکھنے والا واقف نہیں؟ ان کی صحبت میں قدسیہ کی ظرافت اور ذہانت کو اور جلا ملی اور شعر و ادب کا ذوق بھی پیدا ہوا۔ یہی تعلیم صرف بی اے تک تھی جس میں نمایاں کامیابی نہیں حاصل کی تھی۔ لیکن ان کی قابلیت اس سے بہت زیادہ تھی۔ ان کی سوجھ بوجھ، مطالعہ، معلومات غیر معمولی تھیں۔ انگریزی بڑی روانی سے اور بے تکان بولتی تھیں۔ سیاست پر گہری نظر تھی اور بڑے سے بڑے سیاست کے کھلاڑیوں کو وہ بحث میں ہرا کر قہقہے لگا سکتی تھیں۔ شعر و ادب پر گفتگو کرتیں تو ادیب و نقاد اُن کا منہ تکتے رہ جاتے۔ آرٹ اور کلچر سے تو ان کو خاص ذوق تھا ہی اور اس میدان میں ان کا لوہا سبھی نے مانا اور اس کے لئے خاص کر ڈراما اور اسٹیج کے احیا کے لیے انھوں نے اتنا کچھ کیا جس کا احاطہ آسان نہیں۔

۱۹۳۷ء میں ان کی شادی سید بشیر حسین زیدی سے ہوئی جو اس وقت ریاست رامپور کے چیف منسٹر تھے۔ ریاست رامپور خاصی بڑی ریاست تھی اور اس کا چیف منسٹر ہی اس کا کرتا دھرتا ہوتا تھا۔ چیف منسٹر کے ساتھ اس کی بیوی پر بھی بہت سی ذمے داریاں عائد ہوتی تھیں بہت سے کاموں میں ہاتھ بٹانا پڑتا تھا۔ سرکاری تقریبوں میں شرکت کرنا، انگریز "ولی نعمت" افسروں سے نپٹنا، "سرکار" یعنی والیِ ریاست کی مرضی اور حکم کا خیال رکھنا، بڑی بڑی دعوتوں میں میزبانی کے فرائض انجام دینا، والیِ ریاست کے پورے خاندان سے عزیزانہ و نیازمندانہ تعلقات رکھنا اور خدا جانے اور کیا کیا۔ قدسیہ کی طبیعت آزاد تھی اور صاف گوئی اور خودداری ان کے مزاج کا جز و۔ مگر شوہر کی خاطر ان کو ریاستی آداب کو نباہنا پڑتا تھا۔ اگرچہ وہ اس سے خاصی الجھتی تھیں۔ ساتھ ہی اپنے شوہر کے وسیع خاندان کی ذمہ داریاں بھی اٹھانی ہوتی تھیں اور بیس بائیس برس کی اس ناتجربہ کار لڑکی نے چند مہینوں میں بڑی خوبی سے ان خوشگوار اور ناخوشگوار فرائض کو سمجھ کر

ان کا بار اپنے کندھوں پر اٹھا لیا۔ اس سے بھی عجیب بات یہ ہے کہ اس ناسازگار ماحول میں انھیں بچوں کے ادب سے دلچسپی پیدا ہوئی اور نہ صرف اس کے لیے وقت نکالا، بلکہ دل و جان سے اس میں لگ گئیں۔ انگریزی زبان میں سینکڑوں بچوں کی کتابوں کو پڑھا، تصویروں کا مطالعہ کیا اور یہ دھن لگ گئی کہ اردو میں بچوں کے لیے بہترین چھپائی لکھائی اور تصویروں کے ساتھ کہانیوں کی دلچسپ کتابیں شائع کی جائیں۔

انھوں نے بچوں کا ادب کھنگالا اور اس میں جو موتی نظر پڑا اسے چن لیا۔ جو کہانی پسند آئی اسے وہ ہندستانی روپ میں ڈھال کر، سلیس، رواں، آسان زبان میں بچوں کے لیے اردو کی ایک پیاری سی کتاب مرتب کر دیتیں۔ آرٹسٹوں سے تصویریں بنوانے میں سینکڑوں روپیہ صرف کر دیتیں، اپنے پاس سے چھپواتیں۔ شاید ۱۹۴۸ء یا ۱۹۴۹ء کا ذکر ہے جب میں ان کے ہاں رامپور گئی ہوئی تھی۔ اس وقت وہ اپنی بچوں کی پہلی کتاب ابیلی بچھیا مرتب کر رہی تھیں۔ کیا انہماک تھا، کیا شوق تھا۔ ہر وقت اسی کا ذکر، اسی کی فکر، تصویریں دیکھی جارہی ہیں، بحث ہو رہی ہے، تخمینہ بن رہا ہے، طباعت و اشاعت کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں، جیسے اس سے بڑھ کر اہم کام دنیا میں ہے ہی نہیں۔ ان کے شوہر زیدی صاحب اور دوست ذاکر صاحب کو بھی بچوں کے لیے عمدہ کتابیں چھپوانے کا شوق تھا اور ان لوگوں نے ان کے شوق کو اور مہمیز دی۔ اس وقت تک ہمارے ہاں یہ سمجھا جاتا تھا کہ بچوں کے لیے کتابیں لکھنا بڑا آسان کام ہے، مگر قدسیہ زیدی جانتی تھیں کہ بچوں کے لیے لکھنا بڑوں کے لیے لکھنے سے بھی زیادہ دشوار کام ہے۔ پھر ان کا اصول تھا کہ جو کام کیا جائے اچھی طرح کیا جائے۔ گاندھی بابا کی کہانی لکھنے میں جتنی محنت اور جان کاہی قدسیہ نے کی اکثر لوگ بڑے بڑے علمی اور تحقیقی مقالے لکھنے میں اس سے آدھی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے۔ کئی کئی بار ایک ایک باب کو لکھتیں، زبان اور ادب کے ماہرین کو دکھاتیں، گاندھی جی سے جو لوگ بہت قریب تھے ان سے مشورے لیتیں۔ بار بار ترمیم و تنسیخ کرتیں۔ کسی سے مشورہ یا مدد دینے میں انھیں ذرا بھی جھجک نہ ہوتی

تھی معمولی لوگوں سے لے کر بڑے عالموں، ادیبوں، نقادوں ہر ایک سے بے تکلفی کے ساتھ بغیر کسی احساس کمتری یا برتری کے وہ مشورہ اور مدد لیتی تھیں اور معقول ہوتا تھا تو مانتی تھیں۔ انھوں نے بچوں کے لیے کئی کتابیں لکھیں۔ دوسری زبانوں سے اڈیٹ بھی کیں اور خود بھی لکھیں اور کم و بیش ہر ایک میں اسی طرح محنت کی۔ کچھ شائع ہو چکی ہیں کچھ ابھی زیور طباعت سے محروم ہیں۔ اگر قدسیہ نے صرف اسی صنف ادب کو اپنایا ہوتا تو وہ اس میدان میں اپنا لوہا منوا لیتیں۔ گاندھی بابا کی کہانی بچوں کے لیے گاندھی جی پر لکھی تمام کتابوں سے بہتر مانی گئی ہے۔ پنڈت نہرو نے اس کا دیباچہ لکھ کر اور وزارت تعلیم نے اس موضوع پر لکھی بہترین کتاب مان کر اسے انعام دے کر اعتراف بھی کیا ہے۔ مگر قدسیہ کا مزاج بڑا من چلا تھا اور نئے نئے میدان خدمت کے تلاش کرتے ہیں انھیں لطف آتا تھا۔ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش کرنے میں رہتی تھیں۔ جو کام سب سے مشکل اور بظاہر ناممکن سا نظر آئے قدسیہ اس کا بیڑا بڑھ کر اٹھا لیتی تھیں اور تن من سے اس میں لگ جاتی تھیں۔

شنکر کے بچوں کے آرٹ کے مقابلے تصویروں اور گڑیوں کی نمائشوں سے انھیں بڑی دلچسپی تھی۔ اگر یہ کہوں کہ شنکر ان مقابلوں اور نمائشوں کی روح رواں شنکر ہی کی طرح قدسیہ بھی تھیں تو یہ مبالغہ نہ ہوگا۔ وہ انتہائی ذوق و شوق اور اور محنت سے سارے کام و انتظام کرتیں اور پھر اس کمال سے پس پردہ رہتیں کہ قریب کے لوگوں کے سوا کسی کو بھی پتہ نہ چلتا کہ ان میں قدسیہ کا کتنا ہاتھ ہے۔ یہی کیا جامعہ ملیہ میں خاص کر اس کی پچیس سالہ جوبلی میں اور بعد میں علی گڑھ یونیورسٹی کے کاموں میں انھوں نے کتنا حصہ لیا کس قدر خدمات انجام دیں، کٹھن وقتوں میں کیسے کیسے سہارے دیے یہ چند ہی لوگ جانتے ہیں۔

لیکن جس کام کے پیچھے انھوں نے اپنے کو مٹا دیا تھا وہ تھا ہندوستانی تھیٹر۔ شمالی ہند میں پھر سے اچھا ڈراما اور تھیٹر کا ذوق پیدا کرنا۔ دوسری زبانوں کے

بہترین کلاسیکی ڈراموں کو عوامی رنگ میں ڈھال کر لوگوں کے سامنے پیش کرنا اور ان کے بگڑے مذاق کو (جس کو گھٹیا فلموں نے اور بگاڑ دیا تھا) سنوارنا ان کا مقصد تھا جس کی خاطر نہ وہ دن کو دن سمجھتی تھیں نہ رات کو رات۔ سات آٹھ سال پہلے انھیں پہلے پہلے ڈرامے لکھنے اور ایڈیٹ کرنے سے اور پھر اسٹیج سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ لفظ دلچسپی اس ذوق و شوق، اس انہماک، اس محنت کے لیے جو قدسیہ نے کی بہت ہلکا لفظ ہے۔ ان کے ہاں دلچسپی کے معنی ہوتے تھے تن من دھن سے اس میں جان توڑ محنت کرنا۔

قدسیہ کا انگریزی ادب کا مطالعہ اچھا خاصا تھا۔ اور جب سے ڈراما سے دلچسپی پیدا ہوئی، تو پھر انھوں نے شاید ہی انگریزی کا کوئی ڈراما چھوڑا ہو جسے پڑھا نہ ہو۔ ساتھ ہی اردو زبان کے سب ڈرامے، پرانے اور نئے پڑھ ڈالے۔ ہندی اور سنسکرت وغیرہ کے پڑھ نہیں سکتی تھیں تو سنتی تھیں اور ان میں سے جو بھی ڈراما پسند آجاتا اس کو اردو یا ہندستانی کا جامہ پہنانے کی دھن میں لگ جاتی تھیں۔ بار بار پڑھتیں یا سنتیں۔ گیت لکھواتیں، ادیبوں سے زبان پرکھواتیں، نقادوں سے مشورے لیتیں۔

جس لگن اور محنت سے وہ یہ کام کرتی تھیں کوئی غریب ادیب زندہ رہنے کے لیے کم کرتا ہوگا۔ لطف یہ کہ اس کے ساتھ ساتھ سارے سوشل اور خاندانی اور سماجی فرائض بھی انجام پاتے رہتے۔ لوگ ملنے آجا رہے ہیں۔ ان کی خاطر تواضع ہو رہی ہے، پان کھائے جا رہے ہیں، کافی بن رہی ہے، دنیا بھر کی باتیں، لطیفے قصے ہو رہے ہیں، قہقہے لگ رہے ہیں، کسی کی دلداری ہو رہی ہے کسی کو بنایا جا رہا ہے، سامنے فرشی لمبی سی میز پر بہت سی کتابیں، چند کاپیاں، قلم دوات وغیرہ دھرے ہیں۔ اس سلسلے میں کام کرنے والے دو ایک لوگ بھی بیٹھے ہیں۔ جیسے ہی تھوڑا وقت ملا پھر کاغذ قلم سنبھال لیا دو چار سطریں لکھ یا کاٹ ڈالیں۔ جب سب چلے گئے، تو کام میں جٹ گئیں۔ پھر لوگ آ گئے۔ قلم دوات رکھ دیا گیا اور خاطر داری شروع ہو گئی۔ رات گئے تک صبح سویرے، دوپہر اور شام کو لوگ تفریح یا آرام کرتے، ان

آخری چند سالوں میں قدسیہ ایک جفاکش مزدور کی طرح تالیف و ترجمہ کے کام میں جُٹی رہتی تھیں ۔ انھوں نے خود ڈرامے تخلیق نہیں کیے ۔ وہ اپنے کو ادیب کہنی یا سمجھتی بھی نہ تھیں ۔ ہاں دوسری زبانوں کے ڈراموں کو اردو اور ہندستانی کا جامہ پہنا کر انھوں نے ڈرامے کی بڑی خدمت کی ہے ۔ ممکن ہے سخت گیر نقاد ان کے کاموں کو اعلیٰ معیاری ادب میں جگہ نہ دیں ، مگر یہ حقیقت ہے کہ اسٹیج کو قدسیہ وہ کچھ دے گئیں جس کو بھلایا نہیں جا سکتا ۔ ان ڈراموں میں شکنتلا ، گڑیا گھر مٹی کی گاڑی ، خالہ کی خالہ ان کے مشہور اور مقبول ڈرامے ہیں جن کو خود ان کی زندگی میں اور ان کی زیرِ نگرانی بار بار اسٹیج کیا گیا اور عوام و خواص میں پسند کیا گیا اور ان کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری ہے ۔

اچھے ڈراموں کے لیے اچھے اسٹیج کی ضرورت ہوتی ہے اور ہندستان خصوصاً شمالی ہند میں یہ قریب قریب ختم ہو چکا تھا ۔ قدسیہ نے اس کمی کو پورا کرنے کا عزم کر لیا اور حسب عادت جرأت مندانہ سے کام لے کر ہندستانی تھیٹر قائم کر ڈالا ۔ اس تھیٹر کے لیے انھوں نے بہت کچھ کیا ہے جس پر ان کا کوئی ساتھی اگر چاہے ، تو پوری کتاب لکھ سکتا ہے ۔ اس کے لیے انھوں نے کیا کیا پاپڑ بیلے ۔ چندے کیے تھیٹر میں کام کرنے والے کہاں کہاں سے ڈھونڈھ کر لاتی تھیں ، فن کاروں اور شاعروں کے کیسے کیسے نخرے اور ناز برداریاں اٹھاتی تھیں نوجوانوں سے کس محبت اور اپنائیت کا سلوک کرتی تھیں مخالفوں کی کیسی کیسی باتیں سہارتیں ! اس مقصد کی خاطر انھوں نے عیش و آرام تج دیا ، کٹھن سفر کیے ، آرٹسٹوں کے ساتھ دوپہر کو بازار کے چھولے بھٹورے کھائے ۔ دن رات ان کو سکھانے میں بسر کیے ، ان کے ساتھ زمین پر سوئیں اور کیا کچھ نہیں کیا ۔ کسی بھی دوسرے کوشل کام میں وہ اس سے بہت کم محنت سے بہت زیادہ شہرت اور ناموری پا سکتی تھیں ، مگر سہل کام قدسیہ کو رجھاتے نہ تھے ۔ جو کام ہر کوئی کر سکے اس کے کرنے میں لطف ہی کیا ؟ وہ تو اس کام کی شیدا ہوتی تھیں جس میں رکاوٹیں ہوں ، مخالفتیں ہوں ، کٹھنائیاں ہوں ! قدسیہ کو فکر تھی کہ ہندستانی تھیٹر

کو نمونے کا اسٹیج بنا کر ہندی تھیٹر کو حیاتِ نو بخشیں اور سارے ملک میں اسے مقبول بنائیں۔ ساتھ ہی اس کے لیے اتنا سرمایہ فراہم کر جائیں کہ مالی مشکلات اس کی راہ میں حائل نہ ہوں۔ مگر صد حیف کہ قدسیہ کی عمر نے وفا نہ کی۔ اتنی سخت محنت ان کا جسم سہار نہ سکا اور وہ یوں اچانک چل بسیں جیسے پھول سے خوشبو اڑ جاتی ہے!

لیکن یہ ادبی اور تہذیبی کام قدسیہ کی زندگی کا ایک پہلو تھا، پوری زندگی نہیں۔ وہ قدرت کی طرف سے ایسا دماغ لے کر آئی تھیں جس میں گوناگوں دلچسپیاں اور صلاحیتیں پوشیدہ تھیں۔ جس شوق سے وہ قومی، ادبی، تہذیبی کاموں میں حصہ لیتی تھیں اس سے بھی زیادہ لگن اور شوق سے وہ چھوٹے چھوٹے گھریلو کام اور خاندانی ذمہ داریاں اٹھاتی تھیں۔ دوستوں، ہمسایوں اور نوکروں اور راہ چلتے لوگوں تک کی خوشی اور غم میں حصہ لیتی تھیں اور مدد کرتی تھیں۔ انھیں زندگی سے پیار تھا، زندگی کی ہر چیز سے شوق تھا۔ انسانیت پیاری تھی، انسان عزیز تھا۔ ان میں غیر معمولی صلاحیت تھی اور وہ خود بھی یہ جانتی تھیں جس خوبی سے کسی چھوٹی سی شادی یا گھریلو تقریب کا انتظام کرتیں اس سے بھی زیادہ حسنِ انتظام بڑی بڑی شادیوں، تقریبوں، جوبلیوں اور دوسرے کاموں میں نظر آتا۔

قدسیہ ہر حیثیت سے بڑی خوش قسمت عورت کہی جا سکتی ہیں۔ قدرت جتنی نعمتیں دنیا میں کسی کو دے سکتی ہے سب اُن کو حاصل تھیں۔ حسن، ذہانت، قابلیت، فراغت، صحت، ظرافت، محبت، شہرت، ہر دل عزیزی کیا نہ تھا ان کے پاس۔ قدرداں اور عاشق زار شوہر، سعادت مند اور قابل اولاد، چاہنے والے دوست۔ ایسا انسان جتنا بھی مغرور یا خود پسند، عیش پرست اور تن آسان نہ ہو کم ہے۔ لیکن قدسیہ میں ان کمزوریوں کا دور دور پتہ نہ تھا۔ یہ نہیں کہ وہ اپنی صلاحیتوں سے آگاہ نہ تھیں۔ بے جا انکسار بھی نہیں کرتی تھیں۔ یہ بھی جانتی تھیں کہ لوگ ان سے کس قدر متاثر ہوتے ہیں اور اس اثر سے کام لینا بھی جانتی تھیں۔ یہ بات بھی وہ سمجھتی تھیں کہ جس کام میں ہاتھ ڈالیں گی اُسے کامیابی نصیب ہوگی۔ ان کے عزم

کے آگے پہاڑ بھی ٹوٹ سکتا ہے۔ قدسیہ کا خیال آتا ہے تو مجھے رانی جھانسی یاد آتی ہیں۔ وہ پرانے زمانے میں پیدا ہوتیں تو چاند بی بی ہوتیں یا جھانسی کی رانی! قدسیہ نے باطل سے سمجھوتہ کرنا نہیں سیکھا تھا۔ حق کے لیے وہ ہر چیز سے ٹکر لینے کے لیے تل جاتیں اور جس کام کا بیڑا اٹھا لیتیں اس کو بہر صورت پورا کرتیں۔ وہ مزاج کی تیز اور زبان کی طرار تھیں اور اپنی ان کمزوریوں کو جانتی بھی تھیں۔ مگر ان کی دوسری صفات ایسی تھیں کہ لوگ ان کی باتوں کا برا کم ہی مانتے تھے۔ خوشامد، چاپلوسی اور مصلحت پسندی ان کی فطرت کے خلاف تھی۔ یہ سوچے بغیر کہ ان کا مخاطب کتنا بڑا صاحب اثر و اقتدار ہے۔ بے دھڑک سوال جواب کرتیں اور غصہ آ جائے تو سخت لفظوں میں جواب دیتیں۔ ایک بار اس وقت کے ایک وزیر جو بڑے صاحب اثر سیاست داں بھی ہیں، اور ان سے قدسیہ اور ان کے شوہر کے کافی تعلقات بھی تھے۔ جامعہ کے ایک صاحب کو علی گڑھ میں ایک ہزار روپے کی جگہ پر بلانے پر معترض ہوئے کہ جامعہ میں سو روپے پانے والے کو اتنی بڑی تنخواہ کیوں دی گئی؟ قدسیہ غصے میں بے قابو ہو گئیں اور تڑسے جواب دیا "جی ہاں! آپ جامعہ کے ایک فرد کو جو پچھتر ہی روپے تنخواہ پاتا تھا، آپ نے وائس پریسیڈنٹ بنا دیا ہے۔" وہ حضرت لاجواب ہو کر منھ دیکھنے لگے۔ کمال یہ ہے کہ مزاج میں ایک طرف چٹانوں کی سی سختی اور کھر دراپن تھا تو دوسری طرف ریشم کی سی نرمی اور شہد کی سی شیرینی اور گھلاوٹ بھی تھی۔ ان کے بعض دوست ان سے کہا کرتے تھے ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے بھائی

لیکن ان کی سب سے اہم خصوصیت جس نے اُن کو اپنوں اور غیروں سب میں بے حد محبوب بنا دیا تھا وہ تھا احساسِ فرض، اور دردمندی۔ احساسِ فرض ایک ایسا لفظ ہے کہ جسے بہت محدود معنوں میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے اور انتہائی

وسیع معنوں میں بھی، یہ تو اس پر منحصر ہے کہ انسان اپنے فرائض کیا سمجھتا ہے۔ بعض لوگ جو اپنی ذات کو مرکزِ کائنات سمجھتے ہیں صرف "اپنا" ہی حق ادا کرتے ہیں یا اپنے بال بچوں تک احساس فرض کو محدود کر دیتے ہیں۔ مگر گنتی کے کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے فرائض کو اپنے رشتے ناتوں میں قید نہیں کرتے اور جتنا بڑھاتے جائیں انھیں اسی میں خوشی اور سکون ملتا ہے۔ قدسیہ ان ہی میں سے ایک تھیں۔ ان کے "فرائض" کے وسیع دامن میں نہ صرف اعزا و احباب بلکہ ہر وہ شخص سما سکتا تھا جو کسی طرح ان تک پہنچ جائے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ اس اجمال کی تھوڑی سی تفصیل کروں!

قدسیہ بیاہ کر جس خاندان میں آئیں، وہ سادات بارہہ کے "کھرے سیدوں" کا تھا جہاں اس وقت تک کسی غیر خاندان، غیر سادات، غیر مذہب کی لڑکی کا لانا گویا گناہ اور خاندان کے نام پر داغ سمجھا جاتا تھا۔ سید شبیر حسین زیدی کی نسبت ۱۹۲۸ء میں سیدہ خاتون[۱] سے ہوئی تھی لیکن ۱۹۲۹ء میں اچانک وہ فوت ہوگئیں اور کئی سال تک زیدی صاحب نے اسی صدمہ میں شادی کا خیال بھی نہیں کیا۔ ان کی والدہ، چچا، بھائیوں بہنوں سب کو بڑا ارمان تھا ان کے بیاہ کا۔ آخر ۱۹۳۵ء میں وہ اس پر تیار ہوئے کہ بخاری کی بہن قدسیہ بیگم سے شادی کریں۔ نومسلم کشمیری گھرانے کی لڑکی جب ایسے خاندان میں بیاہ کر آئی ہوگی تو اس کی طرف سے کیا کچھ تعصب نہ ہوگا اس کا اندازہ لگانا آج کے زمانے میں آسان نہیں۔ وہ شیعہ نہ تھیں اس کی وجہ سے تعصب کا رنگ اور گاڑھا تھا۔ ایک نوجوان ناتجربے کار آزاد ماحول میں پلی ہوئی لڑکی کے لیے بڑا کڑا امتحان تھا۔ اگر وہ چاہتیں تو سب جھگڑے بکھیڑوں سے بچ کر، اپنے شوہر کے ساتھ آرام سے الگ رہ سکتی تھیں۔ لیکن قدسیہ نے دیکھا کہ زیدی صاحب اپنی والدہ کے بڑے سعادت مند بیٹے اور خاندان کے دلدادہ، سرپرست اور کفیل ہیں اگرچہ کفالت اور مدد الگ رہ کر بھی کی جا سکتی تھی، مگر قدسیہ نے کٹھن

۱۔ بنت خواجہ محمد ثقلین مرحوم

راہ کو اپنا لیا اور دل میں ٹھان لی کہ اس نئے ماحول میں رہ کر، قدامت پرست گھرانے کے افراد کو انھیں رام کرنا ہے اور جس طرح انھوں نے اس ہفت خواں کو طے کیا ہر کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ ان کی سیرت کی پختگی اور دل کی وسعت کا پہلا اندازہ یہیں ہوا۔ ایک طرف اپنے اصولوں اور روشن خیالی کو انھوں نے خیرباد نہیں کہا۔ دوسری طرف خاندان والوں کے ساتھ اس طرح نباہ اور سلوک کیا کہ تھوڑے ہی عرصے میں ہر ایک ان کا کلمہ پڑھنے لگا۔ کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ ان کے پاس روپیہ تھا، اثر و ذرائع تھے جس کی وجہ سے وہ لوگوں کی مدد اور ان کے ساتھ سلوک کر سکتی تھیں مگر صاحب حیثیت اور صاحبان اقتدار کی تنگ دلی اور خود غرضی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ اور قدسیہ صرف مالی مدد ہی نہیں کرتی تھیں بلکہ وہ دل سے اپنے نئے رشتے داروں کو چاہتی تھیں۔ یہ ان کی بے لوث خدمت اور سچی محبت کا جادو تھا جس نے قدامت پرستی، تنگ نظری اور تعصب کو زیر کیا اور سب کے دل جیت لیے۔ اس وسیع خاندان کے سارے مسائل اب ان کے اپنے تھے۔ لڑکیوں اور لڑکوں کی تعلیم اور منگنی بیاہ، بے روزگار کو روزگار سے لگانا، بیماروں کا دوا علاج، غمزدوں کی دلداری، بچوں کی نگہداشت، نوجوانوں کی دلجوئی، روز کے آنے جانے والے مہمانوں کی میزبانی اور بوڑھی ساس کی دیکھ بھال اور خدمت، ان سب ذمہ داریوں کا بار انھوں نے اپنے کندھوں پر اٹھا لیا۔ جس کو جس وقت جس مدد کی ضرورت ہوتی، قدسیہ اس کے لیے مستعد نظر آتیں۔ کوئی شک نہیں کہ اس میں ان کے شریک حیات کا پورا تعاون اور اعتماد بھی شامل تھا ورنہ وہ تنہا اس سے عہدہ برآ نہ ہو سکتی تھیں۔

قدسیہ سنی خاندان کی لڑکی تھیں اور مذہب کے ظاہری ارکان کی کچھ زیادہ پابند بھی نہ تھیں۔ ابتدا میں صرف اس بات کی وجہ سے ان کو بہت کچھ سننا اور سہنا پڑا۔ مگر قدسیہ کی مزاج کی تیزی اور نیام سے نکلی تلوار کی سی صاف گوئی کی وجہ سے لوگ ان سے دبتے بھی تھے۔ مذہبی کٹر پن سے ان کو سخت چڑھ تھی۔ لیکن ساتھ ہی ان کا دل نورِ ایمان سے روشن تھا اور اس بات کا ہمیشہ خیال رکھتی تھیں کہ دوسرو

کے جذبۂ عقیدت کو ٹھیس نہ لگے۔ میں نے بعض مجالسِ میلاد میں انھیں خوفِ خدا سے کانپتے دیکھا ہے۔ مجالس عزا میں آنسوؤں کا دریا بہاتے پایا ہے۔ جن لوگوں کو اس پر اعتراض تھا کہ سنی بہو اس گھرانے میں آئی ہے ان کو بھی قدسیہ کے طرزِ عمل نے شرمندہ کر دیا۔

زیدی صاحب کے والد کے زمانہ سے ان کے وطن کگرولی میں چہلم امام حسین کے زمانے میں دس مجالس اربعین کی ہوا کرتی تھیں۔ شادی کے چند سال بعد ہی قدسیہ نے ان مجلسوں کی ذمّہ داری اپنے اوپر لے لی اور تقریباً بیس سال تک وہ ہر زمانہ، ہر موسم میں، اپنے ہزار کام چھوڑ کر، سفر کی تکلیفیں جھیل کر، گاؤں کی کٹھن زندگی کی پروا کیے بغیر کگرولی جاتیں دس دن رہتیں اور بڑی عقیدت اور نہایت حسن انتظام کے ساتھ ان مجالس کا انتظام کرتیں۔ اعلیٰ پایہ کے واعظ اور ذاکر مجالس پڑھنے آتے سینکڑوں افراد خاندان اور آس پاس کے گاؤں کے لوگ مجلس میں شرکت کے لیے آتے اور قدسیہ ان کی دیکھ بھال بھی کرتیں وہاں پردہ پردہ بھی کرتیں تھیں گاؤں کی جاہل سے جاہل اور غریب سے غریب عورتوں سے بالکل برابری سے بلکہ جھک کر ملتیں، ان کے برابر بیٹھتیں، ان کے مذاق کی باتیں کرتیں، کھنکتے قہقہے لگاتیں اور ان کو یہ محسوس ہوتا کہ یہ بہو تو ہیرا ہے۔ گاؤں کی عورتیں ان کی اتنی دلدادہ تھیں کہ تعریف کرتے نہ تھکتیں۔ ایک بار ان کے شوہر نے حیرانی سے پوچھا "قدسیہ گاؤں کی عورتیں آخر تمھاری اس قدر دلدادہ کیسے ہو گئیں؟"

سادگی سے ہنس پڑیں "کچھ نہیں ڈارلنگ۔ بات بس اتنی ہے کہ یہاں کی اعلیٰ خاندان کی سیدزادیاں تو انھیں منھ ہی نہیں لگاتیں۔ میں ذرا ان بے چاریوں سے ہنس بول لیتی ہوں اس لیے وہ مجھ سے محبّت کرنے لگی ہیں!"

ان مجالس کی ذمّہ داریوں کو قدسیہ نے آخر دم تک پوری عقیدت اور لگن سے انجام دیا۔ آج ان کے سسرال اور گاؤں کا ہر فرد ان کی یاد میں آنسو بہا رہا ہے اور ہر زبان ان کی تعریف میں رطب اللساں ہے۔ ہندی عورت کا یہ ناقابلِ تسخیر

قلعہ جس طرح قدسیہ نے فتح کیا وہ کیسا کٹھن کام تھا یہ صرف عورت ہی سمجھ سکتی ہے۔
میں قدسیہ سے ان کی شادی کے دو تین سال بعد ملی تھی۔ دونوں ہی طرف ایک عجیب سی جھجک تھی۔ جب ۳۹ء میں ایک دن زیدی صاحب ان کو لے کر میرے گھر دلی آئے تو اگرچہ جھجک دونوں طرف باقی تھی، مگر اس خوبصورت، تیکھے نقش و نگار اور کچھ شرمائی اور گھبرائی سی اپنی ہی ہم عمر لڑکی کو دیکھ کر اچانک میرے دل میں ان کی محبت کا ایک سوتا پھوٹا۔ اور جب اگلے سال میں چند ہفتے ان کے ساتھ جا کر رام پور رہی تو ہم دونوں محبت کے اس اٹوٹ بندھن میں بندھ گئے جو بہن اور دوست دونوں کے امتزاج سے ہی پیدا ہو سکتا ہے۔ بیس برس تک مجھ سے اور میرے شوہر سے ان کے بہت قریبی تعلقات رہے۔ عابد صاحب وہ صرف "عابد بھائی" کہتی ہی نہ تھیں، سمجھتی بھی بھائی ہی تھیں اور ان سے بڑی عقیدت رکھتی تھیں۔ اہم سے اہم مسئلے پر ان سے مشورہ کرتیں اور اکثر مان لیتیں۔ مجھ سے وہ عمر میں چند ماہ چھوٹی تھیں، مگر رشتہ بڑا تھا اور چھوٹی بہن کی طرح برتاؤ کرتی تھیں۔ اس دوستی کے ناتے، جو اتنے عرصے ہم دونوں میں رہی میں نے ان کی سیرت کو قریب سے دیکھا اور پرکھا۔ جب ملاقات ہوتی تو پھر وہی خلوص، اپنائیت اور قربت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان کا دائرۂ احباب بہت وسیع تھا مگر چند افراد جن میں ذاکر صاحب، سید حسن صاحب، عابد صاحب، گھونندان سرن اور دوسرے کئی افراد شامل تھے ان سے بہت زیادہ قریب تھے اور ان کے لیے وہ سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتی تھیں، جو جتنا مطالبہ کرے یا جس کو وہ جتنا مستحق سمجھیں۔

قدسیہ زندگی میں جتنی آگے بڑھتی گئیں ان کے عمل کا دائرہ اور "خاندان" وسیع ہوتا گیا۔ عزیزوں کے عزیز، دوستوں کے دوست اور عزیز، طالب علم، فن کار شاعر، ادیب، پڑوسی، ملازم سب ان کے خاندان میں شامل تھے۔ بس کسی کا اتنا کہنا کافی ہوتا "یہ کام تو آپ ہی کریں گی۔ ہمارے بس کا نہیں" پھر قدسیہ اس کام میں جان کھپا ڈالیں گی۔ خود اپنا مذاق اڑا کر کہا کرتی تھیں "بس کوئی مجھے چوڈھرا ہمیشہ

دیدے پھر میں ہر کام کرسکتی ہوں" مگر اس "چودھراہٹ" کے پیچھے نام و نمود کی نہیں خدمت کی لگن کا جذبہ ہوتا تھا۔ اب چاہے کسی رئیس یا رئیسہ کو "ریاست" ہی دلوانے کا معاملہ کیوں نہ ہو یا کسی مستحق طالب علم کو وظیفہ دلوانا ہو کسی بیمار کا آپریشن کرانا ہو کسی لڑکی کی شادی کی مہم درپیش ہو، یکساں شوق اور ان تھک محنت کے ساتھ قدسیہ اس فرض کو انجام دیتی تھیں۔ دیکھنے والوں کو لگتا جیسے اس عورت کو اس کے سوا اور کوئی کام ہی نہیں۔ ان کی مثال ابر رحمت کی سی تھی جو بے تکان برستا چلا جاتا ہے اور خود نہیں جانتا کہ کس کس کو اس سے فیض پہنچا ہے: ضرورت مند کا ان کی زد میں آنا شرط تھا۔ کتنے لوگ ان کے چلے جانے سے بے سہارا ہو گئے، یہ کوئی نہیں جانتا۔ اور سب سے زیادہ ان کے وہ چاہنے والے جن کو ان کی ذات سے محبت، خلوص اور اپنائیت کی دولت ملی تھی کہ سب کچھ مل جاتا ہے چاہنے والا درد مند دل رکھنے والا دوست کہاں ملتا ہے؟

لیکن خود قدسیہ کو کبھی یہ گھمنڈ نہیں ہوا کہ میں کتنوں کی مدد کرتی ہوں کتنوں کا سہارا ہوں۔ میں نے تو یہی کہتے سنا "ہائے۔ میں۔ میں تو کچھ بھی نہ کرسکی۔ فلاں کے لیے" اور آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک آجاتی۔ ان کا یہ انکسار اور درد مندی ہی لوگوں کا دل موہ لیتی تھی ورنہ محسن سے تو عام طور پر احسان مندوں کو کچھ پرخاش ہی سی ہو جاتی ہے۔

یہ کہنا غلط ہوگا کہ ان کے مخالف اور دشمن نہ تھے۔ دنیا میں ایسا کون خوش قسمت ہے۔ بعض تو ایسے لوگ جو ان کی وجہ سے بن گئے ان کے مخالف بن بیٹھے۔ لیکن زیادہ تر یہ مخالفت ذاتی وجوہ سے نہیں ہوئی۔ وہ سچائی کی خاطر لوگوں کی مخالفت مول لے لیا کرتی تھیں یا ان کی بے دھڑک صاف گوئی کی وجہ سے لوگوں کو شکایت ہوتی۔ یا کاموں میں رکاوٹ پڑتی دیکھ کر وہ راہ کے کانٹے صاف کر دیتی تھیں۔ اس کے نتیجے میں لوگ کیا کہتے ہیں، لوگ ان کے مخالف بن گئے ہیں یا دشمن، ان کو رتی برابر پروا نہ ہوتی تھی۔

ریاست رام پوران ریاستوں میں تھی جنھوں نے سب سے پہلے جمہوریہ ہند کے ساتھ اپنے کو ضم کر دیا۔ اس میں ظاہر ہے بشیر حسین زیدی اور قدسیہ بیگم دونوں کا ہاتھ تھا۔ لیکن قدسیہ ریاست کے ماحول سے کبھی خوش نہیں رہیں۔ اور جب وہ اور زیدی صاحب دلی آ گئے، تو انھوں نے بہت سکون کا سانس لیا اور اپنی پسند کی، عمل سے بھرپور زندگی بسر کرنی شروع کی۔ لیکن چند سال بعد ذاکر صاحب کے اصرار پر زیدی صاحب علی گڑھ کے وائس چانسلر ہو کر چلے گئے۔ قدسیہ دلی چھوڑنا نہیں چاہتی تھیں۔ اب وہ کبھی کبھی علی گڑھ چلی جاتیں زیادہ تر جامعہ میں جو مکان کرایے پر لیا تھا اس میں رہتیں اور اپنے ڈراما اور اسٹیج کے کاموں میں منہمک، اس محنت شاقہ کا اثر ان کی صحت پر پڑ رہا تھا مگر دوسروں کا کیا وہ خود بھی اس کو محسوس نہ کرتی تھیں۔

زندگی کی اس مختصر مدت میں قدسیہ نے کتنا کام کر ڈالا کتنے مداح اور محبت کرنے والے پیدا کر لیے، سوچتی ہوں تو حیرت ہوتی ہے۔ ان کی ایک رفیق کار نے مجھ سے کہا "پانچ مردوں کے بس میں اتنا کام کرنا نہیں تھا جتنا آپا اکیلی کرتی تھیں"۔ شاید ان کے دل کو خبر تھی کہ وقت تھوڑا ہے اور کام زیادہ، جتنا زیادہ سے زیادہ کام کر سکیں کر جائیں۔

ان کی جدائی کی کسک کے ساتھ ساتھ ہمیشہ مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ قدسیہ بڑی خوش قسمت تھیں۔ بھلا ایسی زندگی اور موت کس کو نصیب ہوتی ہے! کام اتنا کر گئیں کہ سو سال بھی زندہ رہنے پر اس سے زیادہ کیا کوئی کر سکے گا۔ ہر دلعزیزی اتنی پائی، جو لاکھوں میں سے کسی کے حصے میں آتی ہے، اپنے پیاروں کو سلامت چھوڑ کر، اپنے محبوب شوہر کی آغوش میں مسکراتے ہوئے انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ ایک تابناک زندگی اور قابل رشک موت۔

ان کا حسین مسکراتا چہرہ آفتاب سے مشابہ تھا کہ جہاں پہنچ جائیں زندگی کھل اٹھتی تھی۔ ان کا زمزمہ بار قہقہہ دلوں میں مسرت کی لہریں پیدا کر دیتا تھا۔ روشن

آنکھوں کا یہ عالم تھا کہ ؎

جس طرف نظریں اٹھیں، شمع فروزاں ہوگئیں!

بھلا ایسی ہستی کے ساتھ موت کا تصور کیا بھی کیسے جا سکتا ہے! موت اس ہستی کو کیسے فتح کر سکتی ہے جس نے کسی سے زیر ہونا سیکھا ہی نہ تھا۔ وہ تو زندہ ہیں اور رہیں گی۔ اپنے علمی، ادبی، تہذیبی کاموں کی شکل میں۔ وہ زندہ رہیں گی۔ اپنے پیاروں کے دلوں میں، اپنے دوستوں، عقیدت مندوں اور احسان شناسوں کی یادوں میں جن کو انھوں نے ماں کا پیار، بہن کا خلوص، دوست کی الفت کی بے بہا نعمتوں سے مالامال کیا!۔

# ایسی چنگاری بھی یارب

آل احمد سرور

قدسیہ زیدی ۲۵ دسمبر کی شام کو کالکا میل سے علی گڑھ واپس آئیں ہندستانی تھیٹر کی ایک پارٹی مغربی بنگال اور بہار کے صنعتی علاقوں کا دورہ کر رہی تھی۔ کھانے پر میں بھی موجود تھا۔ وہ اپنے دورے کا حال بتاتی رہیں۔ علی گڑھ کے حالات پوچھتی رہیں۔ اس دورے کے زمانے میں اول تو انھیں یہ خیال رہتا تھا کہ لڑکوں اور لڑکیوں کو کسی طرح تکلیف نہ ہو، دوسرے یہ فکر تھی کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو کھیل دیکھنے کا موقع ملے۔ وہ چاہتی تھیں کہ ان مزدوروں کو جن کی زندگی کانوں میں کام کرتے کرتے خشک اور بے کیف ہو گئی ہے، فن کی کچھ بصیرت مل جائے، ان کی روح میں کچھ تازگی آئے اور احساس میں کچھ بالیدگی ہو، وہ زندگی کی اچھی قدروں کو پہچان سکیں۔ جن افسروں نے ان کی پارٹی کا پروگرام بنایا تھا انھیں ان باتوں سے سروکار نہ تھا۔ اپنے مخصوص انداز میں وہ ان لوگوں پر تنقید کر رہی تھیں جن کا فرض تو عوام کی فلاح کا خیال رکھنا ہے، مگر جو صرف اپنی سہولت کو دیکھتے ہیں۔

۲۶ر کو انڈین ہسٹری کانگریس کا اجلاس شروع ہوا۔ شام کو وائس چانسلر کی طرف سے ایٹ ہوم تھا۔ اس میں وہ مہمانوں کا اپنے مخصوص تبسم اور اپنے شگفتہ اور برجستہ فقروں کے ساتھ استقبال کر رہی تھیں۔ کچھ مہمان سنترے کھا رہے تھے اور چھلکے نیچے پھینکتے جا رہے تھے۔ کسی نے ایک سنترہ ان کی طرف بڑھایا تو کہنے لگیں کہ

فرش پر دیسے ہی چھلکوں کا ڈھیر ہے' میں اس میں اضافہ نہیں کرنا چاہتی۔ اس کے بعد قہقہہ لگایا گویا ان کے بچپن کو معاف کر دیا ہو۔ اس دن وہ کچھ تھکی ہوئی ضرور معلوم ہوتی تھیں مگر ان کی زندہ دلی شگفتگی اور بذلہ سنجی میں کوئی کمی نہ تھی۔ رات کو ان سے ملاقات نہ ہوئی۔ صبح نو بجے وائس چانسلر کے یہاں میٹنگ تھی۔ میں کچھ منٹ پہلے وہاں جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا کہ آدمی آیا اور اس نے خبر دی کہ بیگم زیدی کا انتقال ہو گیا۔ بڑی دیر تک یقین نہ آیا اور یقین بھی کیسے آتا۔ زندگی اور زندہ دلی کا یہ مجسمہ، شادابی اور شگفتگی کی یہ تصویر، بسی ہوئی بجلیوں اور پارے کا یہ مرکب' حرکت اور عمل کا یہ پیکتا ہوا شعلہ، فنا بھی ہو سکتا ہے۔ مگر یقین کرنا پڑا۔ بالزاک نے کہیں کہا ہے۔ موت ہی سب سے بڑی حقیقت ہے، باقی سب کچھ افسانہ ہے۔ فطرت سب کچھ کر سکتی ہے۔ یہ زندگی دیتی بھی ہے اور چھین بھی لیتی ہے۔ روشنی عطا کرتی ہے اور پھر گھپ اندھیرا کر دیتی ہے۔ یہ نور کی بارش کرتی ہے اور اس نور کو تاریکی کے سمندر میں غرق کر دیتی ہے۔

قدسیہ زیدی ۲۳ دسمبر ۱۹۱۴ء کو پیدا ہوئیں۔ ان کے آباؤ اجداد کشمیر سے آئے اور دہلی میں بس گئے۔ ماں باپ کا انتقال ان کی کم سنی میں ہو گیا تھا۔ بڑی بہن نے جنکی شادی پروفیسر احمد شاہ بخاری پطرس سے ہوئی تھی، انھیں پالا اور اعلیٰ تعلیم دلائی۔ بی۔ اے کا امتحان دیا تھا کہ سید بشیر حسین زیدی سے جو اس وقت رام پور میں چیف منسٹر تھے، ان کی نسبت طے ہو گئی۔ اس نسبت کے طے کرنے میں سید آصف علی اور بیگم آصف علی کا بڑا ہاتھ تھا۔ شادی سے پہلے ایک دفعہ زیدی صاحب ان کے یہاں اپنا سگریٹ کیس بھول آئے جو سونے کا تھا۔ انھیں خیال ہوا کہ شاید مجھ پر رعب جمانے کے لیے یہ کھیل کھیلا گیا ہے۔ خفا ہو گئیں اور اس وقت تک خفگی رہی جب تک یہ یقین نہ ہو گیا کہ یہ واقعی بھول تھی۔

اونچے اور روشن خیال گھرانوں میں خواتین کی زندگی، پارٹیوں، جلسوں، قیمتی لباس کی نمائش، سطحی باتوں، رسمی تکلفات اور فضول مصروفیات کا ایک سلسلہ

ہوتی ہے۔ قدسیہ زیدی اس رَو میں نہ بہہ سکیں۔ انھیں اپنے گھر سے دلچسپی تھی اپنے بچوں سے عشق تھا اپنے شوہر کے خاندان سے محبّت تھی۔ وہ جب کمرو تلی جاتی تھیں تو گھر کے سب لوگ انھیں گھیرے رہتے تھے۔ پرانے زمانے کی عورتیں ہوں یا نئے خیال کی لڑکیاں، وہ سب میں مقبول تھیں۔ وہ سب سے ان کی دلچسپی کی باتیں کرتی تھیں۔ خلوص، محبت، خدمت کا ایک اتھاہ سمندر ان کے سینے میں موجزن تھا۔ وہ صورت کے اعتبار سے لاکھوں میں ایک تھیں اور سیرت میں بے مثال۔ جو کوئی ان سے مل لیتا تھا، پھر انھیں کبھی بھول نہ سکتا تھا۔ اور جو انھیں جان گیا، پھر مشکل سے کسی کو خاطر میں لا سکا۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ کچھ لوگ بڑے لائق فائق ہوتے ہیں اور ان کی قابلیت سے دوسرے لوگ متاثر بھی ہوتے ہیں مگر عام طور پر وہ مقبول نہیں ہوتے۔ ہاں جو لوگ دوسروں کے کام آتے ہیں، انسانوں سے ہمدردی کرتے ہیں، ان کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے ہیں، ہر ایک سے پرستش کا مطالبہ نہیں کرتے، بلکہ خود دوسروں کی خدمت کرتے ہیں، وہ ہمیشہ ہر دل عزیز اور مقبول رہتے ہیں۔ قدسیہ زیدی کی مقبولیت کا یہی راز تھا۔ وہ نہ کسی پر رعب ڈالتی تھیں، نہ کسی سے مرعوب ہوتی تھیں۔ وہ دوسروں سے نہ پرستش کا مطالبہ کرتی تھیں نہ خوشامد کا۔ ان کا ایک اخلاقی معیار تھا، جس سے وہ لوگوں کو پرکھتی تھیں جنھیں عزیز رکھتی تھیں، ان کے ہر طرح کام آتی تھیں۔ جن کو ناپسند کرتی تھیں، ان سے اپنے جذبات چھپا نہ سکتی تھیں۔ ان کی طبیعت آئینے کی طرح شفاف تھی۔ اس میں غبار کا نام نہ تھا۔ کسی کا کوئی کام ہوا اور اس نے قدسیہ بھابی سے رجوع کیا۔ اب وہ شخص آزاد ہو گیا، یہ اس کے لیے دوڑ رہی ہیں، لڑ رہی ہیں، جھگڑ رہی ہیں۔ یہاں تک کہ جو کام تھا وہ پورا ہو جاتا تھا۔

رام پور اور دہلی میں ان کا گھر ایسا صاف ستھرا دلکش اور آراستہ تھا اور مہمانوں کی وہ ایسی خاطر مدارات کرتی تھیں کہ ہر طبقے میں بے حد مقبول ہو گئی تھیں۔ انھیں

ادب سے اور فنونِ لطیفہ سے شروع سے دلچسپی تھی چنانچہ ان کے ملنے والوں میں ایسے ہی لوگوں کی تعداد زیادہ تھی، جو ادیب تھے یا فن کار۔ وہ بڑی روادار تھیں، دوسروں کے مذہبی عقائد یا سیاسی خیالات کا احترام کرتی تھیں۔ وہ پکی قوم پرست تھیں۔ وہ پنڈت جواہر لال نہرو سے بڑی عقیدت رکھتی تھیں۔ وہ قومی کاموں میں بڑے حوصلے سے مدد کرتی تھیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی جو بلی میں رام پور سے جو مدد دی گئی، اس میں سب سے بڑا ہاتھ انھیں کا تھا۔ لطف یہ تھا کہ وہ نام و نمود سے بہت دور رہتی تھیں۔ پردے کے پیچھے سے کام کرنا انھیں عزیز تھا۔ انھیں اچھے کاموں میں شریک ہونے سے خوشی ہوتی تھی۔ اپنا پروپیگنڈا انھیں ناگوار تھا۔

جب وہ اور ان کے شوہر دہلی منتقل ہو گئے تو بہت جلد انھوں نے دہلی کے سماجی تہذیبی اور ادبی حلقوں میں ایک ممتاز مقام حاصل کر لیا۔ انھیں بچوں کے ادب سے شروع سے دلچسپی تھی اور انھوں نے بچوں کے لیے کئی کتابیں لکھی تھیں، جن میں گاندھی جی پران کی کتاب خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ مگر جب انھوں نے شنکر کی بچوں کی تصویروں کی نمائش دیکھی تو اس سے اتنی متاثر ہوئیں کہ اس کام کے بڑھانے اور پھیلانے میں دل وجان سے شریک ہو گئیں۔ کئی سال تک انھوں نے اس ادارے کے لیے اپنا بہت سا وقت دیا۔ ایشیائی مصنفین کی کانفرنس کی استقبالیہ کمیٹی نے بہت بڑا کام اپنے ذمے لے لیا تھا۔ مگر نہ روپیہ تھا نہ کارکن۔ ملک راج آنند جو اس کمیٹی کے روحِ رواں تھے پریشان تھے۔ اس وقت قدسیہ زیدی نے ان کی مدد کی۔ روپیہ فراہم کیا۔ کارکن مہیا کیے۔ اپنی دلنواز شخصیت کی وجہ سے وہ مختلف کارکنوں کو یکجا کر سکتی تھیں اور انھیں ایک اچھے کام کے لیے آمادہ کر سکتی تھیں۔ کانفرنس کے پہلے جلسے کے بعد ہی وہ بیمار ہو گئیں۔ مگر اب راستہ صاف تھا، راہ کے کانٹے نکل گئے تھے، کانفرنس ہر معنی میں کامیاب رہی۔

انھوں نے دہلی کے سماجی اور تہذیبی کاموں میں تندہی سے حصہ لینے کے باوجود اپنی ادبی کاوشیں جاری رکھیں۔ شروع میں ابسن اور شا کے کئی ڈراموں

کے ترجمے کیے، برنبیٹ کے چاک سرکل کو اُردو کا جامہ پہنایا۔ چارلیز آنٹ (Charlies Aunt) کا ترجمہ خالہ کی خالہ کے نام سے کیا۔ پھر وہ سنسکرت کے ڈراموں کی طرف متوجہ ہوئیں شکنتلا، مدرا راکشس مٹی کی گاڑی، کے علاوہ امبر پالی کا ترجمہ ہندی سے کیا۔ انھوں نے ان ترجموں پر بڑی محنت کی سنسکرت کے پنڈتوں سے مدد لی۔ کئی کئی دفعہ ترجمہ پر نظر ثانی کی۔ انھیں ڈرامے کی زبان اور مکالمے کی ضروریات کا بڑا اچھا احساس ہو گیا تھا۔ ہمارے بہت سے ڈرامہ نگاروں سے بہتر وہ ڈرامے کے نازک لمحات، اس کے پیچ و خم، اس کے تانے بانے اور اس کے "تاثر" کو سمجھتی تھیں۔ انھوں نے طبع زاد ڈرامے نہیں لکھے۔ ان کا بجا خیال تھا کہ اُردو میں ڈرامے کا شعور اتنا کم ہے کہ ابھی عرصے تک اسے اچھے ڈراموں کے ترجموں سے مالا مال کرنے کی ضرورت ہے۔

چھ سات سال ہوئے انھوں نے ہندستانی تھیٹر کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس کے ذریعے سے وہ ہندستانی ڈراما کے معیار کو بلند کرنا چاہتی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ ہندستان میں مغرب کے تجربوں کی اندھی تقلید مضر ہوگی بلکہ ہمیں ڈراما کے لیے ایسے فارم کو اپنانا ہوگا جس کی روح ہندستانی ہو اور جس میں ہماری روایات سے پورا پورا فائدہ اٹھایا گیا ہو۔ اس غرض سے انھوں نے سنسکرت کے شاہکاروں کے ترجمے کی طرف توجہ کی۔ ہندستانی تھیٹر کا مقصد ایسے پڑھے لکھے نوجوانوں کی تربیت تھی جو محض تفریحاً کام نہ کریں، بلکہ ایک طرف ادب کا اچھا ذوق رکھتے ہوں، اور دوسری طرف اس فن کے لیے اپنا سارا وقت دے سکیں۔ ہر بڑے کام میں ابتدائی منزلیں نہایت صبر آزما ہوتی ہیں۔ انھوں نے جس تن دہی، انہماک، جوش اور جذبے سے، کچھ نہیں سے بہت کچھ تک کے مرحلے طے کیے۔ اس کا پورا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھوں نے کسی قومی کام کے لیے نہ صرف اپنے آپ کو وقف کر دیا ہو، بلکہ اس وجہ سے اپنی زندگی کو ایک خاص پروگرام کے سانچے میں ڈھال دیا ہو۔ انھوں نے ذاتی آسایش کا خیال نہ کیا، بلکہ اس تھیٹر کے کام کے لیے زمین،

دفتر، عمارت، فن کاروں کی تربیت اور سبھی کاموں کی دیکھ بھال کی۔ اس کام سے ان کے ذہن کی جودت، حوصلے کی بلندی، ہمت کی مضبوطی، ہر قسم کے لوگوں سے کام لینے کی اہلیت، بے مثل تنظیمی صلاحیت ظاہر ہوتی۔ انھوں نے شوقِ فضول کو جرأت رندانہ اور جرأت رندانہ کو رمزِ حکیمانہ بنا دیا۔ ان کے دم قدم سے جنگل بیں منگل ہو گیا اور ویرانے میں پھول کھل گئے۔

مرحومہ اپنی دلنواز شخصیت کے علاوہ اپنی غیر معمولی ذہانت کے لحاظ سے بھی اپنی مثال آپ تھیں۔ ان کے ساتھ چلنا آسان نہ تھا۔ وہ لوگوں سے ویسی ہی عقیدے کی صحت، کردار کی پختگی اور حق و باطل کی کشمکش میں ایسی صاف اور واضح رائے کا مطالبہ کرتی تھیں جو ان کی اپنی خاصیت تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔ لیکن ان کے ذہن کا ساتھ دینا اور ان کے معیاروں پر پورا اترنا: ایک امتحان، ایک دعوت، ایک چیلنج بھی تھا۔ ان کی مثال سے کتنے تھکے ہوئے مسافروں کو نیا ولولہ ملا، کتنوں کو اپنی منزل نظر آئی، کتنے سنجیدہ قومی کاموں میں تن من دھن سے لگ گئے، کتنی زندگیاں سدھر گئیں اور کتنی اندھیری بستیاں زندگی اور عمل سے معمور ہو گئیں۔

انھیں ہندستان سے گہری اور والہانہ محبت تھی کہ وہ ہر چیز کو قومی مفاد کے پیمانے سے ناپتی تھیں۔ علی گڑھ اور جامعہ ملیہ کے قومی رول کو واضح کرنے میں اور منوانے میں انھوں نے بڑی مدد کی۔ تنگ نظری اور تعصب کے خلاف وہ برابر جہاد کرتی رہیں۔ جب گذشتہ سال کچھ لوگوں نے اس تنگ نظری کی وجہ سے علی گڑھ یونیورسٹی کے خلاف طرح طرح کے بے بنیاد الزامات تراشے تو انھوں نے ملک کے بڑے بڑے لوگوں کے سامنے نہایت بیباکی سے حق بات کہی۔ مصلحت کو انھوں نے کبھی پرِ کاہ سے زیادہ وقعت نہ دی۔ اقبال کے مومن کی صفت کہ وہ حلقۂ یاراں میں بریشم ہے اور رزمِ حق و باطل میں فولاد، ان کی شخصیت میں بڑی آب و تاب سے جلوہ گر ہوتی تھی۔ ان کا ارادہ تھا کہ ہندستانی تھیٹر کی بنیاد مضبوط ہو جائے تو وہ اس سے

سبکدوش ہو کر چند کتابیں لکھیں۔ مگر موت نے یہ ارادہ پورا ہونے نہ دیا اور وہ اچانک اپنے عزیزوں، ساتھیوں، رفیقوں اور ہزاروں مداحوں کو چھوڑ کر سفرِ آخرت پر روانہ ہو گئیں۔

شخص فنا ہو جاتا ہے شخصیت اپنے نقوش کے ذریعہ سے زندہ رہتی ہے۔ قدسیہ زیدی کی شخصیت ان کے کارناموں کی وجہ سے غیر فانی ہے اور ان کے ذریعہ سے وہی روشنی کی کرن، وہی زندگی کا گداز اور وہی کردار کی پاکیزگی اور لطافت جو ان کی ذات میں تھی، کائنات کے لیے ایک متاعِ عزیز بن جاتی ہے۔ جن لوگوں کو یہ شرف حاصل تھا کہ وہ مرحومہ کو جانتے تھے، وہ ان کی یاد کبھی فراموش نہیں کر سکتے اور اس یاد پر ہمیشہ فخر بھی کرتے رہیں گے۔ جلال و جمال، ان کی شخصیت میں کچھ اس طرح حل ہو گئے تھے کہ وہ اقبال کے اس شعر کی زندہ تفسیر بن گئی تھیں:

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

# قدسیہ آپا

اطہر پرویز

بیگم قدسیہ زیدی، جنھیں دہلی کے تہذیبی حلقوں میں بیگم زیدی اور ہم جیسوں میں قدسیہ آپا کے نام سے جانا جاتا تھا، ہندستانی تہذیب کی علامت تھیں۔ گورا چٹا رنگ، صاف ستھرے لباس میں ملبوس ــ بیک وقت امیرانہ اور قلندرانہ انداز ــ قدیم وجدید کا ایک حسین امتزاج ــ ایک طرف وہ جواہر لعل نہرو کے غیر ملکی سفر پر روانہ ہونے سے پہلے امام ضامن باندھتی تھیں اور دوسری طرف دلّی کے تھیئٹر اور اسٹیج پر لڑکیوں سے ڈراموں میں کام کرواتی تھیں۔ بعض معاملات میں قدرت بے حد ستم ظریف ہوتی ہے۔ وہ دلّی کے تخت پر آخری مغل شہنشاہ کی حیثیت سے ایک شاعر کو بٹھاتی ہے، جب کہ یہ کام کسی اور سے بھی لیا جا سکتا تھا اور ٹیپو سلطان کو انگریزوں سے ایک فیصلہ کن جنگ کے لیے دکن کی ایک چھوٹی سی ریاست میں پیدا کرتی ہے، جو ہندستان میں ہوتے ہوئے بھی ہندستان سے دور تھا۔

بیگم قدسیہ زیدی ایک متمول گھرانے کی آنکھ اور اس کی روشنی تھیں لیکن ان کے سینے میں ایک ہندستانی دل تھا۔ دولت، ثروت، منصب، اوروں کے لیے نعمت ہو سکتے ہیں، لیکن ان کے لیے لعنت ہی رہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک وہ زندہ رہیں، یہ تمام چیزیں ان کے آڑے آئیں۔ ان کو لوگوں نے سمجھنے کی

کوشش نہیں کی۔ ان کی شخصیت کی چمک دمک، ان کے رکھ رکھاؤ کی آب و تاب، سب کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کرتی تھی۔ وہ پطرس کی بہن تھیں، کرنل سید بشیر حسین زیدی کی بیوی؛ ذاکر صاحب، سیدین صاحب، عابد صاحب، سرور صاحب، مجیب صاحب، جیسے اہل علم ان سے محبت کرتے تھے۔ جواہر لعل ان کی غیر معمولی صلاحیت اور ذہانت کے قائل تھے۔ یہ سب اُن کی عزت کرتے تھے لیکن انھوں نے اپنی علمی اور تہذیبی سرگرمیوں میں اُن میں سے کسی کا سہارا نہیں لیا۔ راشٹر پتی سے لے کر دفتر کے معمولی کارکن تک ان کی رسائی تھی۔ وہ پلک جھپکتے کام کرنے کی عادی تھیں۔ انتظار، ٹھہراؤ، صبر و قرار، سکون و اطمینان —— ان کی لغت میں یہ الفاظ شامل نہیں تھے۔ اُن کے دماغ میں خیال اور عمل ایک ساتھ آیا کرتے تھے۔ دونوں پیروں کی طرح ایک ساتھ چلا کرتے تھے۔ ان کی عجلت پسندی آڑے آئی —— جس طرح وہ زندگی میں عجلت سے کام لیتی تھیں، مرنے میں بھی انھوں نے دیر نہ کی۔ اگر وہ اتنی جلدی نہ کرتیں، تو شاید زیدی صاحب موت کو منا لیتے۔ لیکن آناً فاناً سب کچھ ہو گیا۔ زیدی صاحب دیکھتے رہ گئے۔ روپیہ پیسہ کسی کام نہ آیا۔ وہ ایک لمحہ میں بیمار ہوئیں، اور دوسرے ہی لمحے موت کی آغوش میں پہنچ گئیں۔ انھوں نے مرنے کے لیے دواؤں، ڈاکٹروں، اور تیمارداروں کا انتظار نہ کیا۔ اچانک دل کی حرکت بند ہوئی اور وہ آخری سفر پر روانہ ہو گئیں۔ ایک سیدھے سادے غریب ہندستانی کی موت اسی طرح ہوتی ہے۔ اگر ان کی روح کہہ سکتی تو یہی کہتی کہ "یہی میری پسندیدہ موت تھی"۔

قدسیہ آپا مجھ سے کہا تھا کہ ۲۷ دسمبر ۶۹ء کو صبح ملنا، ضروری کام ہے۔ ڈائری میں ایسی ملاقاتیں نوٹ نہیں کرتی تھیں، —— لیکن وہ کبھی بھولتی نہ تھیں۔ جسے جو وقت دیتی تھیں، اس کی پابندی کرتی تھیں۔ ان کے پاس بیٹھ کر اپنے وی، آئی، پی ہونے کا احساس ہوتا تھا۔ زندگی کی ساری کدورتیں دھندلا جاتی تھیں —— ہاں، تو ۲۷ دسمبر کی صبح آئی۔ میں ان کے پاس جانے کی تیاری کر رہا تھا۔

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ بنیاد صاحب (انجمن ترقی اردو کے ایک کارکن) آئے۔ میں سمجھ گیا کہ قدسیہ آپا کا ٹیلی فون آیا ہے۔ انھوں نے بلایا ہوگا ۔ میں نے سوچا قدسیہ آپا نے اپنے معمول میں فرق نہ آنے دیا۔ وہ پھر سبقت لے گئیں۔ میں نے بنیاد صاحب سے کہا۔ "میں تیار ہوں۔ بس قدسیہ آپا کے پاس ہی جارہا ہوں ٹیلی فون آئے کتنی دیر ہوگئی۔ آپ کہہ دیں میں پہنچ ہی رہا ہوں "۔ میں نے ایک سانس میں سب کچھ کہہ دیا۔ بنیاد صاحب گھبرائے ہوئے کھڑے تھے۔ بولے "مگر ان کا تو انتقال ہوگیا۔ یہی میں کہنے آیا تھا، شاید آپ کو معلوم نہ ہو"۔

اب میں گھبرا گیا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے؟" مجھے زندگی میں پہلی بار محسوس ہوا کہ زمین پاؤں کے نیچے سے کیسے سرکتی ہے۔ کوئی بلندی سے کیسے گرتا ہے۔ بھری دوپہر میں کیسے رات ہوجاتی ہے۔ الفاظ کس طرح احساسات کا ساتھ نہیں دیتے، آنکھوں کے سامنے کیسے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ پھر میں نے بڑی کوشش کرکے اپنے حواس جمع کیے۔ اور سوچنے لگا "مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ قدسیہ آپا کیسے مرسکتی ہیں۔ کیا موت اتنی سنگدل ہوسکتی ہے۔ ہاں اُن کی روح قبض کرنے کے لیے موت کو اپنے آداب یقیناً توڑنے پڑے ہوں گے۔ میں نے جلدی جلدی زیدی صاحب کی کوٹھی کی طرف قدم بڑھائے، اگر کوئی خیال میرے دماغ میں تھا تو یہی کہ یہ کیا ہوگیا۔ کیسے ہوگیا۔ اور اگر کوئی آرزو تھی تو یہی کہ اے اللہ! یہ خبر غلط ہو۔ کسی دشمن نے اڑائی ہو۔ لیکن اس آرزو کو خاک ہونا تھا۔ پھر بھی مجھے ایسا لگا کہ جب میں پہنچوں گا تو وہ حسب معمول کہیں گی "تم نے اتنی دیر کردی ۔ ابھی کتنے کام کرتے ہیں"! واقعی مجھے دیر ہوگئی تھی۔ قدسیہ آپا جاچکی تھیں۔ جلد باز تھیں نا ۔

میں نے بہتوں کو کہتے سنا ہے کہ کام عبادت ہے۔ لیکن قدسیہ آپا کو سچ مچ عبادت کرتے دیکھا ہے۔ وہ بڑے خشوع وخضوع سے عبادت کرتی تھیں۔ ہمہ تن عبادت کرتی تھیں۔ ان کی فطری سادگی اور شخصی پاکیزگی، تقدس پیدا کردیتی

تھیں۔ وہ محض کسی کام کو اپنے ذمے نہ لیتی تھیں، انھیں تو دُھن سوار ہوجاتی تھی۔ پھر وہ نہ دن دیکھتی تھیں نہ رات۔ سردی دیکھتی تھیں نہ گرمی۔ بس وہ تو کام میں لگ جاتی تھیں۔ ہر چیز سے بے خبر۔ اور جب تک اُسے ختم نہ کرلیتی تھیں، چین سے نہ بیٹھتی تھیں۔ کام ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہوجاتے۔ لیکن ان کے کام کبھی ختم نہ ہوتے۔ اسی لیے وہ ساری زندگی چین سے نہ بیٹھ سکیں۔ ان کا بس چلتا تو وہ وقت کی طنابوں کو کھینچ کر بڑا کرلیتیں۔ ذاکر صاحب کا قول تھا کہ اگر کوئی کام اس لائق ہے کہ کیا جائے تو یقیناً اس لائق بھی ہے کہ سلیقے سے کیا جائے۔ قدسیہ آپا میں یہ سلیقہ مندی موجود تھی۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی اپنے کام سے بے خبر نہ ہوتی تھیں۔ شکنتلا کا ترجمہ کیا جارہا ہے۔ سنسکرت پڑھی جارہی ہے۔ لباس کی تیاری ہو رہی ہے۔ کتاب چھپنے کی فکر لاحق ہے۔ موسیقاروں سے ربط قائم کیا جارہا ہے۔ اداکاروں کی تلاش جاری ہے۔ قدسیہ آپا بے حد تھکی ہوئی ہیں۔ میں کہتا ہوں۔ "قدسیہ آپا! آرام کرلیجیے، سب کام ہوجائے گا۔"

"ہاں بھائی آرام بھی کریں گے۔ یہ دیکھو کتنے کام کرنے ہیں۔ ذرا کناٹ پلیس تک چلیں۔ اُدھر دو ایک کام ہیں۔"

کار میں بیٹھ کر روانہ ہوجاتی ہیں۔ یوں تو ابھی دن ڈوبنے میں بہت دیر ہے لیکن سردی بڑھتی جارہی ہے۔ آج میں محض ایک سویٹر پہنے ہوئے ہوں۔ اور سوچ رہا ہوں کہ مجھے جلد ادکھلا جانا چاہیے۔ بس اسٹینڈ تک پہنچنے میں دیر لگے گی۔ ابھی اتنی سردی بھی نہیں ہے۔ میں بھی خاصا تھکا ہوا ہوں۔ لیکن قدسیہ آپا سے باتیں کررہا ہوں۔ اختر رائے پوری کے ترجمے پر بات ہورہی ہے۔ دشینت کا ذکر ہے۔ 'شکنتلا' کے چوتھے ایکٹ کے چوتھے سین کے چوتھے اشلوک کا تجزیہ ہورہا ہے۔ قدسیہ آپا نے شکنتلا کی روح کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ وہ شکنتلا کے اسٹیج کے مسائل پر باتیں کررہی ہیں۔ ہندستانی تھیٹر کیسے بنے گا۔ حبیب تنویر کب ہندستان

آکر ہاتھ بٹائیں گے۔ بڑی تیزی سے باتیں ہو رہی ہیں۔ مسائل کی بھیڑ لگی ہوئی ہے ایسا لگتا ہے کہ کیو ٹوٹ گیا ہے۔ لیکن قدسیہ آپا کے ذہن میں ترتیب قائم ہے۔ گاڑی کناٹ سرکس کی ایک دکان کے پاس جا کر رک جاتی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ قدسیہ آپا نے ڈرائیور کو کہاں لے جانے کو اور کب کہا۔ ہم ایک شاندار ڈریپر کی دکان میں داخل ہوئے۔ طرح طرح کے گرم کوٹ دیکھے۔ مجھ سے رائے لی گئی۔ دکاندار سے فرمائش کی گئی کہ اچھے سے اچھا کپڑا دکھایا جائے۔ میں دکان کی سجاوٹ دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ قدسیہ آپا جلدی سے خریدیں اور چلیں۔ ذرا سی دیر میں وہ فارغ ہوگئیں۔ پھر ہم کافی ہاؤس میں داخل ہوئے۔ اب ہم کافی پی رہے تھے۔ قدسیہ آپا پھر شکنتلا کے بارے میں باتیں کرنے لگیں۔ اچانک ایک لڑکی پر نظر پڑی۔ سامنے میز پر چند لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ مجھ سے بولیں ۔ "پرویز! اس لڑکی کے بارے میں کیا خیال ہے کیسی رہے گی؟"

میں نے کہا " میری شادی ہو گئی ہے۔"

کہنے لگیں "تم مردوں میں یہ عیب ہے کہ لڑکی کو صرف شادی کے نقطۂ نظر سے ہی دیکھتے ہو۔ ارے میاں! یہ لڑکی شکنتلا بن کر کیسی رہے گی؟"

میں نے کہا "آپ کی کافی ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ یہ دہلی یونیورسٹی کی لڑکیاں معلوم ہوتی ہیں۔"

"ارے بھائی! شکنتلا کے لیے لڑکی ہی تو چاہیے۔ وہ کہیں کی بھی ہو۔ دلی کی ہو، علی گڑھ کی، شانتی نکیتن کی۔"

ہم لوگ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پھر اٹھے۔ قدسیہ آپا مختلف جگہوں پر گئیں۔ اخیر میں بیگم پٹودی کے یہاں گئیں۔ نواب بھوپال آئے ہوئے تھے۔ قدسیہ آپا میرا تعارف کراتے ہوئے بولیں "نواب صاحب! یہ آپ کے مرحوم دوست ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے عزیز ہیں۔"

نواب بھوپال جناب حمید اللہ خاں صاحب نے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا اور بڑی دیر

تک باتیں کرتے رہے۔ درمیان میں قدسیہ آپا کوئی مزے کی بات کہہ دیتیں اور پھر بیگم پٹودی سے باتیں کرنے لگتیں۔ انھوں نے شکنتلا کا ذکر کیا۔ کالی داس ان کے ذہن پہ حاوی تھا۔ نواب صاحب پر اُن کی ذہانت اور علمیت کا اثر ہو رہا تھا۔

ہم لوگ وہاں سے اُٹھے۔ وہ نہ جانے کس کس سے ملیں۔ کتنی باتیں کیں۔ کتنے کام کیے۔ ان کے سامنے وقت بھی بڑی تیزی سے گزرتا تھا۔ گھنٹے سکنڈوں میں تبدیل ہوتے تھے۔ اب رات شروع ہوگئی تھی۔ اکدم سے وہ اٹھیں۔ ارے دکانیں بند ہونے کا وقت ہے۔ مجھے کناٹ پلیس جانا ہے۔ ذرا سی دیر میں ہم پھر اسی ڈریسر کی دُکان میں پہنچے۔ وہاں کوٹ تیار تھا۔ نوک پلک درست کر دی تھی۔ دکاندار مجھے پہنا کر دیکھ رہا تھا۔ گویا وہ کوٹ جسے میں تھیٹر کا لباس سمجھ رہا تھا، میرے لیے تھا اور جب میں دُکان سے باہر نکلا تو مجھے خیال آیا کہ میں اس سردی میں پیدل چل سکتا ہوں"۔

دو ایک روز بعد جب میں گھر گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہی لڑکی قدسیہ آپا کے ڈرائنگ روم میں بیٹھی کافی پی رہی تھی۔ وہی کافی ہاؤس والی لڑکی۔ میرا منھ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ قدسیہ آپا نے بتایا کہ یہ لڑکی شکنتلا میں کام کر رہی ہے۔ یہ خود بھی تیار ہے اور اس کے گھر والوں کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اور یہ سب چٹکی بجاتے میں ہوا ہے۔ اسی ہفتے میں شکنتلا کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ یہ ہمارے "ہندستانی تھیٹر" کی پہلی پیش کش تھی۔ پھر تو ڈراما مختلف جگہوں پر اسٹیج ہوا۔ علی گڑھ میں بھی پیش کیا گیا۔ ان کی اپنی لڑکی اسٹیج پر آئی۔ دہلی کے مسلمانوں کے تہذیبی حلقے انگشت بدندان تھے۔ سید بشیر حسین زیدی نے یہ کیسے گوارا کیا۔ چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں۔ لیکن بیگم قدسیہ زیدی نے اسٹیج کو وقار دیا تھا۔ عزت و آبرو بخشی تھی۔ ان کا احترام لوگوں کے دلوں میں بڑھ گیا۔ ہندستانی تھیٹر نے برسوں دلّی کے اسٹیج پر دھوم مچائی، لیکن کبھی کوئی بُری بات اس تھیٹر سے منسوب نہ ہوئی۔ لڑکے اور لڑکیاں ان کے ساتھ کام کر کے اپنے کو معزز سمجھتی تھیں اور ان کی عزت پر کبھی حرف نہ آیا۔ جامعہ سے تین مورتی تک سب ان کے مدّاح تھے۔

اس کے بعد قدسیہ آپا کے کاموں کی رفتار بڑھ گئی ۔ بہت تیز ۔ وہ ڈراموں کے ترجمے کر رہی تھیں' ان کو پروڈیوس کر رہی تھیں ۔ اداکار آتے اور جاتے رہے ۔ جس لڑکی کو انھوں نے شکنتلا بنایا تھا اور اس پر محنت کی تھی' وہ فلم میں کام کرنے کے لیے بمبئی پہنچ گئی تھی اور وہاں "کلپنا" کے نام سے ہیروئن بن کر فلموں میں آ رہی تھی ۔ گویا شکنتلا پر کی گئی محنت ختم ہو گئی تھی' لیکن قدسیہ آپا کے ماتھے پر کوئی شکن نہ تھی ۔ وہ پہلے کی طرح حوصلہ مند اور جوان تھیں ۔ دور دور سے اداکاروں اور کام کرنے والوں کو لا رہی تھیں ۔ نمائش کے میدان میں انھیں دفتر اور اسٹیج مل گیا تھا ۔ وہاں بڑے زور و شور سے کام ہو رہا تھا ۔ ارشاد پنجن، نیاز حیدر، مونیکا مصرا، اور ان گنت لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے ۔

ایک چہل پہل تھی' ٹیپو محل سے جامع مسجد تک ہر طرف شور تھا ۔ ہندستانی تھیٹر زوروں پر کام کر رہا تھا ۔ گویا ایک نئے دور کا آغاز ہو چکا تھا ۔ زیدی صاحب علی گڑھ کے وائس چانسلر ہو کر آ گئے تھے اور اس کی تعمیر و ترقی میں مصروف تھے ۔ قدسیہ آپا نے دلّی کی تہذیبی زندگی کے ہنگاموں کو ڈی ۔ سی ہاؤس کے پُرسکون ماحول پر ترجیح دی ۔ وہ بظاہر علی گڑھ آرام کے لیے آتیں ۔ لیکن یہاں ان کی جگہ زیدی صاحب کا عالیشان ڈرائنگ روم نہ تھا ۔ وہ تو ایک فرشی چھوٹے سے کمرے میں بیٹھتیں ۔ ایک سلائی مشین ان کے سامنے ہوتی ۔ نوجوان ادیبوں اور شاعروں کا مجمع لگا رہتا ۔ ہم لوگ اس کمرے کو دیوان عام کہتے ۔ یہیں سب اپنا رونا روتے ، زمانے کے گلے شکوے کرتے' مسئلے مسائل حل کرتے ، اور سب کچھ مشین کے ساز پر ہوتا ۔ وہ تھیٹر کے لیے کپڑے زیورات تیار کرتیں ، ضرورت مندوں کے لیے اپنے ہاتھ سے سلائی کرتیں' اس طرح وہ دو تین روز رہتیں ۔ اور ان کے جانے کے بعد ڈی سی ہاؤس میں پھر وہی غرض مند لوگ دکھائی دیتے ۔ یونیورسٹی کے سیاست دان اور اکابرین ، جو صبح و شام اس کی قسمت کے فیصلے میں مصروف رہتے ۔ یہ کوٹھی اُن کے مسائل کے لیے اجنبی نہ تھی ۔ ان کے چہروں اور ان کی آوازوں سے اس کے در و دیوار آشنا تھے ۔ ان کی گفتگو یہاں

کی فضا میں گونجتی تھی۔ اجنبی تو تھیں وہ آوازیں اور وہ چہرے جو قدسیہ آپا کے دیوان عام میں دکھائی دیتے تھے اور یہ لوگ تھے یہاں کے نوجوان شاعر اور ادیب؟ اور یہ آوازیں ان کے جانے کے بعد خاموشی سے ان کو ڈھونڈتی بھی رہتی تھیں۔

قدسیہ آپا ذہین بھی تھیں اور سمجھدار بھی۔ وہ زندگی میں کامیاب نہ تھیں اس لیے کہ زندگی مصلحت اندیشی کا تقاضا کرتی ہے۔ وہ راہ راست سے نہیں چلتی تھیں کیونکہ اس کے لیے سوچنا نہیں پڑتا۔ وہ دائیں بائیں دیکھتی چلتی تھیں۔ انھوں نے لوگوں سے محبت بھی کی اور نفرت بھی۔ اور ان دونوں میں ان کے یہاں اعتدال نہ تھا۔ وہ کاموں سے محبت کرتی تھیں اور وہ بھی مشکل کاموں سے، جن گرہوں کو کوئی نہ کھول سکتا تھا اس کے لیے وہ اپنے ناخنوں سے خون نکال لیتی تھیں، لیکن ان گرہوں کو کھول کر دم لیتی تھیں اور جب گرہ کھل جاتی تو وہ بھول جاتی تھیں اور اپنے اوپر ذرا بھی بوجھ نہ رکھتی تھیں۔ میں جانتا ہوں کہ اگر وہ ایسا کریں تو یہ بوجھ دوسروں سے زیادہ خود ان پر ہوتا۔ پھر وہ اس طرح پیش آتیں کہ اس آدمی کو شکریہ ادا کرتے ہوئے شرمندگی محسوس ہوتی۔ میں نے ان کو بہتوں کے کام آتے دیکھا لیکن مجھے کوئی شکریہ ادا کرتے نظر نہ آتا تھا کیونکہ وہ نیکی کر کے دریا برد کر دیتی تھیں۔

مجھے خواجہ حسن نظامی سے ملنا تھا۔ ایک کہانی حاصل کرنا تھی۔ اس سے پہلے میں نے خواجہ صاحب کو دیکھا بہت تھا، لیکن ان سے ملنے کی سعادت حاصل نہ ہو سکی تھی۔ قدسیہ آپا سے ذکر کیا۔ کہنے لگیں "چلو میں تم کو ملائے دیتی ہوں، تمھارا کام ہو جائے گا؟" لیکن اس روز قدسیہ آپا بے حد مصروف تھیں۔ ذاکر صاحب آئے ہوئے تھے۔ انھیں ایک لمحے کی بھی فرصت نہ تھی۔ اس لیے میں نے ان سے ایک تعارفی خط لے لیا۔ میں نے جب وہ خط خواجہ صاحب کو دکھایا تو وہ یکدم سے کھڑے ہو گئے "میاں حکم دو۔ کیا کام ہے؟"

شرمندگی کے مارے میری زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکل رہا تھا۔ خواجہ صاحب

اس طرح کھڑے ہو جائیں گے ۔ یہ بات میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھی ۔ کہنے لگے "جانتے ہو یہ تم کس کا خط لائے ہو ۔ یہ وہ لڑکی ہے جس کے باپ نے میری پھانسی کا پھندہ اپنی انگلیوں سے کھولا تھا ۔ جب " ہارڈنگ بم کیس " میں مجھے الجھایا گیا تھا ، اُس وقت قدسیہ بی بی کے باپ دلّی کے سب سے بڑے پولیس فسر تھے ۔ انھوں نے نہ جانے کس کس طرح میری بیڑی کی اور میری گلوخلاصی ہوئی ۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ یہ لڑکی جب بھی ملتی ہے یا مجھے کوئی خط لکھتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے میں نے ہی اس کے ساتھ کوئی احسان کیا ہے ۔ دراصل قدسیہ بی بی تو اپنے خاندانی احسان کو بھول گئیں ، لیکن میں کیسے بھول سکتا ہوں کہ میں اپنے گلے میں اُن ہاتھوں کی نرمی محسوس کر رہا ہوں ۔"

خواجہ صاحب پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوگئی ۔ وہ دیر تک ان کا ذکر کرتے رہے ۔ اور اس کے بعد انھوں نے اُسی وقت ایک کہانی لکھ کر دی جس کا مسودہ آج بھی میرے پاس محفوظ ہے ۔

کرشن چندر کی بیٹی بیمار تھیں ۔ وہ ماسکو علاج کے لیے جانا چاہتے تھے لیکن حکومت ان کو پاسپورٹ دینے کو تیار نہ تھی ۔ میں شاہراہ کے دفتر میں گیا تو یوسف صاحب مرحوم ( مالک شاہراہ ) نے بڑی تکلیف کے ساتھ مجھے یہ بات بتائی ۔ میری ملاقات کرشن چندر سے نہیں ہوئی ۔ شام کو میں حسب معمول قدسیہ آپا کے پاس گیا ۔ دوران گفتگو کرشن چندر کے پاسپورٹ کی بات آئی ۔ میں نے کہا " آپ کی حکومت عام انسانی معاملات میں بھی سیاست کو داخل کر لیتی ہے ۔ کرشن چندر کے ترقی پسند ہونے کے یہ معنی نہیں کہ ان کی بیٹی کا علاج نہ ہو سکے ، اور کرشن چند کے خیالات ، اس کے آڑے آئیں ۔ حالانکہ ان کے سیاسی خیالات محض ادب تک محدود ہیں ۔"

پہلی مرتبہ قدسیہ آپا لاجواب ہوگئیں ۔ کہنے لگیں " کافی پیو گے یا چائے ۔ ذرا سی دیر میں کولڈ کافی آگئی ۔ لیکن قدسیہ آپا دوسرے کمرے میں ٹیلی فون پر بات کر رہی تھیں ۔ بے حد غصے میں تھیں ۔ انھوں نے اندرا گاندھی سے بات کی ۔ محمد یونس خان سے بات

کی پنڈت نہرو کے سکریٹری متھائی سے بات کی۔ اور وہی کرشن چندر والی بات۔ ان کی گفتگو سے غم وغصّے کا اظہار ہو رہا تھا۔ شاید میری بات ان کے دل کو لگ گئی تھی۔ وہ بار بار کرشن چندر کی بیٹی کی بیماری کے بارے میں پوچھتی تھیں۔ ان کے چہرے پر کرب کے آثار نظر آرہے تھے۔

اس کے بعد اگلے روز بارہ بجے تین مورتی سے قدسیہ آپا کا ٹیلیفون آیا "کرشن چندر کا پاسپورٹ تیار ہے۔ کرشن چندر کو اطلاع کردو" مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ کرشن چندر کہاں رہتے ہیں۔ اب قدسیہ آپا کرشن چندر کا گھر تلاش کر رہی تھیں۔ دو بجے معلوم ہوا کہ کرشن چندر شملہ جاچکے ہیں، اور ایک ہفتے بعد واپس آئیں گے۔ اور اس کے بعد کرشن چندر جی پاسپورٹ لے کر ماسکو چلے گئے۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے، وہ کرشن چندر سے اس سے پہلے کبھی نہیں ملی تھیں۔ الہ آباد سے ممتاز افسانہ نگار اور ڈراماٹسٹ اپیندر ناتھ اشک آئے۔ وہ ہندی میں ڈرامے لکھ رہے تھے۔ مجھ سے کہا "میں بیگم زیدی سے ملنا چاہتا ہوں"۔
میں نے کہا "ضرور! انھیں بھی ڈراموں سے دلچسپی ہے"۔

میں نے قدسیہ آپا سے ذکر کیا۔ وہ بہت خوش ہوئیں۔ چائے پر دعوت دی۔ شام کو میں اور اشک جی، قدسیہ آپا کے یہاں پہنچے۔ ڈرامے کے بارے میں باتیں ہوئیں، تھیٹر کا ذکر آیا۔ نئے امکانات پر بحث ہوئی۔ اچھے اسکرپٹ کی کمی پر بات ہوئی۔ اشک جی نے اپنی کتابیں قدسیہ آپا کو دکھائیں۔ جب چلنے لگے تو بل پیش کردیا۔ قدسیہ آپا نے روپیہ ادا کردیا۔ ذرا سی دیر کے لیے تو میں گھبرا گیا۔ لیکن مجھے اس پر حیرت نہ ہوئی۔ کیونکہ میں اشک جی کو برسوں سے جانتا ہوں۔ حساب کتاب کے معاملے میں بلکہ دوسری کے سلسلے میں بھی، ان کا ذہن کاروباری ہے۔ ایک بار انھوں نے مجھ سے کہا "تم نے مکتبۂ جامعہ سے میری کتابیں چھپوائی ہیں۔ میں تم کو اس کا کمیشن دینا چاہتا ہوں"۔
میں نے کہا "اشک جی! میں کمیشن ایجنٹ نہیں ہوں۔ آپ کا دوست ہوں"۔
کہنے لگے "مسلمانوں کی سی بات مت کرو۔ یہ کاروبار ہے۔ تم میری کتابیں چھپواؤ،

پبلشر دلواؤ۔ میں اس کے عوض تم کو روپیہ دوں گا۔"
اس بات کا قدسیہ آپا سے کوئی تعلق نہیں۔ قدسیہ آپا ایسی باتوں کا اثر نہیں لیتی تھیں پھر وہ اس بات سے بھی متاثر تھیں کہ اشفاق اپنے ہاتھوں سے کنواں کھودتے ہیں اس لیے انھیں پانی پینے کا بھی حق ہے۔"
جبیب تنویر ڈرامیٹکس کے ایک اسکالرشپ پر انگلستان گئے ہوئے تھے۔ ان کا خط آیا کہ اچانک وزارت تعلیمات حکومت ہند نے ان کا اسکالرشپ کینسل کر دیا ہے۔ انھوں نے مجھے لکھا کہ "کچھ کرو۔ اس ملک میں قرض کی کوئی رسم نہیں ہے۔ میرے لیے قدسیہ آپا محض قدسیہ آپا نہ تھیں۔ میں ملا تھا اور وہ مسجد۔ وہ ہر مرض کی دوا تھیں۔ میں یہ خط لے کر ان کے پاس پہنچا۔ انھوں نے وزارت تعلیمات کے ایک آئی سی ایس افسر کا نام لے کر کہا کہ "یہ ان کی حرکت معلوم ہوتی ہے کیونکہ وہ ایک روز کسی محفل میں کہہ رہے تھے کہ "جبیب تنویر بہت TALENTED ARTIST ہے۔ اس کا جنیئس اسی وقت ابھر سکتا ہے جب وہ فاقے اور احتیاج کی زندگی گزارے۔ لندن کی زندگی اور روزانہ وقت کا سکون اس کے لیے سم قاتل ہے۔" اس پر قدسیہ آپا کو بہت غصہ آیا۔ انھوں نے کہا "حضور! ذرا اپنی ملازمت ترک کر کے اپنی جنیئس کو بھی ابھرنے کا موقع دیں۔ خاصی ضائع ہو رہی ہے۔" پھر انھوں نے کہا "فن، فاقے اور احتیاج کا نام نہیں ہے۔ اس کا تعلق انسان کے دل و دماغ سے ہوتا ہے۔ لوگوں کے درد و غم اپنانے سے ہوتا ہے۔ اس کے لیے طبیعت میں سوز و گداز پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔" قدسیہ آپا پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔
اس کے بعد وہی ہوا جس کی ان سے توقع کی جاتی تھی۔ انھوں نے جواہر لعل نہرو سے ملاقات کی۔ مولانا آزاد سے بات کی۔ اندرا گاندھی جبیب تنویر سے ذاتی طور پر واقف تھیں اور ان کی ذہانت اور صلاحیت کی مداح تھیں۔ کیونکہ جبیب تنویر جب بمبئی سے دلی آئے تھے تو اندرا گاندھی نے ہی انھیں سہارا دیا تھا۔ اب تو معاملہ سنجیدہ ہو گیا۔ مسز وجے لکشمی پنڈت اس زمانے میں برطانیہ میں ہندستان ہائی کمشنر

تھیں۔ انھوں نے بھی اس غلط اقدام پر احتجاج کرتے ہوئے وزیراعظم کو ایک خط لکھا تھا۔ قدسیہ آپا نے اس سے بھی فائدہ اٹھایا۔ اس دوڑ دھوپ کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو روز کے اندر اندر اسکالرشپ بحال ہوگیا۔ متعلقہ افسر سے کیفیت طلب کی گئی، اور یہی نہیں ان کا تبادلہ بھی دوسری وزارت میں کردیا گیا۔

چند روز بعد میں قدسیہ آپا کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ ایک کار آکر رُکی۔ وہی افسر داخل ہوئے۔ چہرے پر اداسی صاف ظاہر تھی۔ قدسیہ آپا نے بیٹھنے کے لیے کہا اور کافی کی ایک پیالی سامنے کردی۔ انھوں نے کہا "آپ نے جواہرلال نہرو کا ڈنڈا استعمال کیا، یہ اچھی بات نہیں کی۔"

"قدسیہ آپا پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ بڑے اطمینان سے بولیں۔" ارے بھائی! جس کے پاس جو ڈنڈا ہوتا ہے وہ اسے استعمال کرتا ہی ہے۔ اگر آپ کے پاس یہ ڈنڈا ہوتا تو کیا آپ اسے چھوڑ دیتے۔"

اس وقت آئی سی ایس افسر کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے یہ وار خالی گیا اور انھوں نے ذرا موضوع سے ہٹ کر کہا۔ "بیگم صاحبہ! میں بڑا بدنصیب ہوں۔ دل کا بُرا نہیں۔ لیکن زبان اور مزاج کی وجہ سے جو منھ میں آتا ہے، کہہ دیتا ہوں۔"

قدسیہ آپا نے کہا "مجھے تو ہندستان میں کوئی بدمزاج نظر نہیں آتا۔ باقی جہاں تک آپ کا سوال ہے آپ تو اچھے خاصے خوش مزاج ہیں۔ میں نے کبھی نہیں سنا کہ آپ نے پنڈت نہرو یا مولانا آزاد سے بدمزاجی کی ہو۔ آپ بدمزاجی کرتے ہیں ماتحتوں سے، طالب علموں سے، اسکالرشپ طلب کرنے والوں سے، جن کو آپ اپنی بائیں ہاتھ کی چھنگلیا سے مسل سکتے ہیں۔"

بیگم زیدی بول رہی تھیں، بولے چلی جارہی تھیں۔ "محترم! اگر آپ مجھ سے پوچھیں کہ مرگی اور ہسٹیریا کے مریضوں میں تم کو کس سے ہمدردی ہے تو میں کہوں گی کہ مرگی کے مریض سے۔ اس لیے کہ آپ نے کبھی نہ دیکھا ہوگا کہ ہسٹریا کا کوئی مریض سڑک پر چلتے چلتے گر پڑا۔ وہ تو ہمیشہ بستر پر گرتا ہے۔ گدّا دیکھ کر گرتا ہے لیکن

مرگی کا مریض کہیں بھی گر پڑتا ہے۔ وہ آگ دیکھتا ہے نہ پانی۔ آپ ہسٹیریا کے مریض ہیں آپ کو غصہ بھی موقع محل دیکھ کر آتا ہے۔" بیگم زیدی بولے جا رہی تھیں۔ ایک آبشار تھا جو اُبل رہا تھا۔

بیگم زیدی کی شخصیت بڑی رنگا رنگ تھی۔ ان میں نہ جانے کتنی جھلکیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ ان کے یہاں آریوں کا جمال بھی تھا اور مغلوں کا جلال بھی۔ ان کو دیکھ کر میں سوچا کرتا ہوں کہ نورجہاں اور قدسیہ محل کچھ ایسی ہی ہوں گی۔ کبھی ان کو دیکھ کر قرۃ العین طاہرہ کا خیال آتا، کبھی وہ امرتا شیرگل لگتیں۔ ان کی شخصیت میں ان تمام عظمتوں کی جھلک نظر آتی تھی۔ کاش ہندستان ان کی بڑائی کو سمجھ سکتا۔

قدسیہ آپا نے ان گنت کتابیں لکھیں۔ بچوں کے ادب میں ان کی حیثیت منفرد تھی۔ جانباز سپاہی، ان تھک جان، جھن جھن بانو، گاندھی باباکی کہانی، ان کی اہم کتابیں ہیں۔ انھوں نے بچوں کے لیے بہترین ڈرامے لکھے۔ جیسے شیر دادا، روگی لومڑی وغیرہ۔

شنکر نریکلی کے شنکر پلے (مشہور کارٹونسٹ) کے ساتھ مل کر انھوں نے بچوں کے بین الاقوامی تصویری مقابلے کو ایک سالانہ فیچر بنا دیا۔ جب اس مقابلے کا کام شروع ہوتا تو قدسیہ آپا دن رات اسی میں لگی رہتیں۔ کبھی بھیقیٹر کا کام کرتیں تو کبھی، شنکر نریکلی کا۔

انھوں نے امتیاز علی تاج کے خاکوں کو "چچا چھکن کے کارنامے کا ڈرامائی روپ دیا۔ اس کے علاوہ بہترین ڈراموں کے ترجمے بھی کیے۔ گڑیا گھر، شکنتلا، خالد کی خالہ، مٹی کی گاڑی، آذر کا خواب، جان بار۔ یہ تمام ڈرامے اب چھپ چکے ہیں اور اسٹیج ہوتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کتنے ڈرامے ہیں جو اب تک چھپ نہیں سکے۔

انھوں نے آخری زمانے میں امتیاز علی تاج کے "انارکلی" کو اسٹیج کی ضروریات کی روشنی میں پھر سے ترتیب دیا اور بعض بے حد خوبصورت اضافے کیے۔

بیگم قدسیہ زیدی کے کارنامے یقیناً آنے والی نسلوں کے لیے بڑی اہمیت رکھیں گے۔

آج اس کی ضرورت ہے کہ ان پر تحقیقی کام کیا جائے ۔ ان کے کارناموں کا جائزہ لیا جائے ۔ وہ ترجمہ کیا کرتی تھیں ۔ ریاضت اور عبادت کا ایک حسین امتزاج تھا ۔ اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھوں نے ان کو اس عبادت و ریاضت میں مصروف دیکھا ہے ۔ ایک ڈرامے کو اردو کا روپ دے رہی ہیں اس میں چوسر کا کھیل دکھایا گیا ہے ۔ چند روز بعد کیا دیکھتے ہیں کہ قدسیہ آپا کے مکان پر چوسر کے دو استاد موجود ہیں ۔ وہ ان سے چوسر سیکھ رہی ہیں ۔ لوگوں نے کہا " اس کی کیا ضرورت ہے ۔ ڈراموں میں تو صرف اشارہ کیا جاتا ہے ۔"

لیکن قدسیہ آپا کہاں ماننے والی تھیں ۔ انھوں نے چوسر سیکھ کر چھوڑا ۔ پھر بڑے اہتمام کے ساتھ ڈرامے کا وہ سین مکمل کیا گیا ۔

چند روز بعد ذاکر صاحب آئے ۔ انھوں نے سین سنا تو بے حد پسند کیا ــــ لیکن اس کے ساتھ ہی اگر چوسر کے بجائے شطرنج کھیلا جائے تو کیسا رہے گا" ــــ ذاکر صاحب تو یہ کہہ کر چلے گئے لیکن قدسیہ آپا کے دل کو لگ گئی ۔ اگلے روز میں جو پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ شطرنج کی بازی جمی ہوئی ہے ۔ قدسیہ آپا شطرنج کھیل رہی ہیں ۔ لیکن شطرنج میں ان کو مزہ نہیں آ رہا تھا ۔ اس وقت ان کو دیکھ کر خیال ہوتا تھا جیسے وہ کسی بڑے فرض سے سبکدوش ہونے کی کوشش کر رہی ہیں ۔ کیونکہ چالیں چلنا ان کی فطرت کے خلاف تھا ۔ دراصل وہ جزئیات پر نظر رکھتی تھیں ۔ وہ جس ڈرامے کا ترجمہ کرتیں، اس کے اندر جذب ہو کر رہ جاتیں ۔ ان کے کردار، ان کے ارد گرد گھومتے رہتے ۔ وہ اسی ماحول میں سانس لینے لگتیں ۔ وہ ڈراما ان کی زندگی کا حصہ بن جاتا ۔

قدسیہ آپا ذہین بھی تھیں اور پُر مذاق بھی ۔ ان کی ہر بات سے ہر عمل سے ذہانت ٹپکتی تھی ۔ ایک روز ہم لوگ لان میں بیٹھے ہوئے تھے، باتیں ہو رہی تھیں، ایک آدمی سامنے سڑک پر گزر رہا تھا ۔ قدسیہ آپا نے کہا " تم لوگ بتاؤ، یہ آدمی کیا کام کرتا ہے ؟"

ہم سب نے کہا " ہم اس آدمی سے واقف نہیں "۔
کہنے لگیں " خدا کو دیکھا نہیں ۔ ذرا عقل استعمال کرو ۔ آپ معلوم ہو جائے گا "۔
ہم لوگ ششش و پنج میں پڑ گئے۔ کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہنے لگیں " اگر تم لوگ ہار مان لو تو میں بتائے دیتی ہوں "۔

ہم سب نے ہار مان لی ۔ کہنے لگیں " دھوبی ہے "۔

اس درمیان میں، وہ آدمی بہت دور نکل گیا تھا ۔ قدسیہ آپا نے ڈرائیور کو بھیجا اسے ڈھونڈ کر لاؤ ، ذرا سی دیر میں وہ آدمی لایا گیا ۔ اس سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ واقعی وہ دھوبی ہے ۔ سب نے کہا آپ اس کو پہلے سے جانتی ہوں گی " قدسیہ آپا ہنسنے لگیں " ارے بھائی عقل سے پتہ چلا یا ہے ۔ غور سے دیکھو اس کے دونوں پاؤں پر ایک ہی جگہ نشان ہے جو پانی میں کھڑے ہونے سے پڑا ہے "۔ قدسیہ آپا نے دھوبی کو پانچ روپے دیئے ۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا بات ہے ۔

آج قدسیہ آپا کو رخصت ہوئے کتنے سال ہو گئے ۔ لیکن ان کی صورت ان کے جاننے والوں کی آنکھوں سے کبھی نہیں مٹ سکتی ۔ وہ جب بھی تہذیب، شرافت، نیکی، حسن، سچائی، دردمندی اور انسان دوستی کو یاد کریں گے، قدسیہ آپا کی شکل آنکھوں کے سامنے پھر جائے گی ۔ یہ تمام صفات علیحدہ علیحدہ مل جاتی ہیں، لیکن ان کا کسی ایک میں جمع ہو جانا، بڑی بات تھی ۔ ان کی موت نے بہتوں کو بے آسرا اور یتیم کر دیا ۔ ان کی یاد سے آج بھی تقویت ملتی ہے ۔ اگر کسی کی یاد ہی سہارا دیتی ہے تو اس کی بڑائی میں کس کو شبہ ہو سکتا ہے ۔ جب کوئی اچھا کام کرنے کا خیال آتا ہے تو قدسیہ آپا بہت یاد آتی ہیں ۔ جب کوئی بے دست و پا نظر آتا ہے، تو قدسیہ آپا کے نہ ہونے کا احساس ہوتا ہے ۔ جب کوئی المناک حادثہ پیش آتا ہے تو نظریں کسی کو خلا میں تلاش کرتی ہیں ۔ اس معاشرے میں دوسروں کے کام آنے والے گنے چنے ہوتے ہیں ۔ اگر کوئی ہوتا بھی ہے تو اس تک ہر ایک کی رسائی نہیں ہوتی ۔ میں اسی لیے انھیں قلندر کہتا ہوں کہ محلوں کی دیواریں انھیں محصور نہ کر سکیں ۔ آزاد

روحیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ وہ کتنی عظیم تھیں، لیکن انھیں اپنی عظمت کا احساس تھا۔
قدسیہ آپانے اپنے فرائض بڑی اچھی طرح ادا کیے۔ انھوں نے زندگی کو بڑے سلیقے سے برتا۔ اب دیکھنا ہے کہ ہم کس حد تک ان کے حقوق کو اپنے فرائض میں بدلتے ہیں۔ اردو زبان و ادب سے محبت کرنے والوں کو قدسیہ آپا کے سلسلے میں اپنی ذمہ داری کو محسوس کرنا ہے۔ قدسیہ آپا محض ایک فرد نہیں، ایک تہذیب بھی تھیں۔ اگر ہم اپنے آپ کو مہذب کہتے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ اس تہذیب کی قدروں کو پہچاننا سیکھیں کیونکہ قدروں کا احساس اور ان کی شناخت انسان کو اشرف المخلوقات بناتی ہیں۔

# قدسیہ زیدی

انیس قدوائی

شگفتہ چہرہ، ہنستی ہوئی آنکھیں اور کھنکتا ہوا قہقہہ۔ قدسیہ کا نام آتے ہی ایک زندگی سے بھرپور شکل نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ مشرقی و مغربی تہذیب کا حسین سنگم، لکھنؤ کی تہذیب، اخلاق اور روزمرّہ کا لطیف امتزاج۔ خوش ذوقی و خوش مزاجی کا مجموعہ۔ قدسیہ نے جہاں قدیم و جدید تہذیب میں خوبصورت تال میل پیدا کر کے دونوں کا حسن دوبالا کیا تھا، وہاں عملی زندگی میں رؤسا و عمائدین سے لے کر معمولی ورکر اور دیہاتی والنیٹر ملازمین تک اور ان سب سے جن سے کسی نہ کسی طرح ان کا تعلق قائم ہو جاتا تھا اپنے ذاتی تعلقات اتنی لطافت سے قائم رکھتے تھے کہ حیرت ہو جاتی تھی۔

رنگین مزاج رؤسا کی رقص و سرود والی محفلوں کا پرتکلف اہتمام، مشرقی دسترخوان سجانے میں ان کا اہتمام اور مغربی ڈنر ٹیبل پر ان کی نفاست مزاجیاں و لطیفے قابل داد تھے۔ بالکل اسی انہماک کے ساتھ پبلک کاموں میں، تھیٹر اور ڈرامے کی تیاری میں، محلوں میں بالک ماتا سنٹر کھولنے یا کسی عمارت کی تعمیر میں، میلاد و مجلس کے انتظام میں اور اعزہ کے شادی بیاہ میں ان کی دلچسپیاں قابل دید تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں خوبصورتی، جامہ زیبی اور مالی فراغت کے ساتھ حسنِ نظر اور دولت علم سے بھی نوازا تھا۔ ساتھ ہی کھلا ہوا ہاتھ اور درد مند دل بھی عطا کیا تھا۔

ان کے چٹکلے، لطیفے، خالص لکھنوی انداز میں مہذب ظرافت، محفل کی جان تھی۔
زندگی کے ہر پہلو کو انھوں نے جانچا پرکھا مگر اپنی شرافت وحمیت کی آب وتاب میں
کمی نہ آنے دی۔

ایک باوقار بیوی کی طرح ان کا گھر بھی سکون، نظم وضبط اور اجتماعیت کا
نمونہ تھا۔ یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب وہ دہلی میں بھگوان داس روڈ پر رہا کرتی تھیں
اور میرا قیام رفیع بھائی کے گھر کنگ ایڈورڈ روڈ (حال مولانا آزاد روڈ) پر تھا۔
اور میری اکثر ان سے ملاقات ہوا کرتی تھی۔ وہ بھی جلد جلد آیا کرتی تھیں۔

مجھے سب سے زیادہ قابلِ تعریف ان کی طبیعت کی رنگا رنگی نظر آتی تھی۔
ان کے گھر میں نوکروں سے لے کر اعزہ واقربا تک سب کی ایک جگہ تھی۔ اپنے بچے
انتہائی اہمیت رکھتے ہوئے بھی آیا یا پرانے نوکر کا ادب کرنے پر مجبور تھے، اور
اس بھابھی کا احترام ملحوظ رکھتے تھے جو ماں سے زیادہ شفیق ممانی یا چچی کے پاس آکر
مہینوں رہ سکتی تھیں۔

رفیع بھائی ان کی انتظامی اہلیت کے اس حد تک قائل تھے کہ بڑی دعوتوں
میں ہمیشہ ان کے مشورے شریکِ کار رہتے تھے۔

وہ نوجوان لڑکے جنھیں ان دنوں ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا اُن کی
فیاضیوں کے مرہونِ منت تھے۔ انھیں نہ جانے کیسے کیسے موقعوں پر انھوں نے
سہارا دیا اور کس کس طرح انھیں کاروباری دنیا میں کامیابی کے راستے دکھائے۔

اپنی فطری سوجھ بوجھ اور ذہانت کی بدولت نوعمری ہی میں بخاری صاحب
اور آل انڈیا ریڈیو سے قربت نے انھیں راگوں کی پرکھ، سازوں کی پہچان اور
موسیقی کے ہر اتار چڑھاؤ سے واقف کر دیا تھا اور یہی چیز ان کے ذوقِ لطیف میں
اضافے کا سبب بنی، پھر رام پور کا ماحول اور بھی سازگار ثابت ہوا۔ گاندھی جی کی
پہلی برسی پر ہم سب چاہتے تھے کہ بچوں کا کوئی ایسا پروگرام ہو، جو عام راستے سے

ہٹ کر اس عظیم ہستی کے شایانِ شان ہو۔ قدسیہ نے رفیع بھائی اور پنڈت جی سے مل کر ایک خوبصورت پروگرام پیش کیا۔ سنگیت اکیڈمی کی مس نرملا جوشی کی خدمات اپنے دیرینہ تعلقات کی بنا پر حاصل کیں۔ جوش صاحب سے بہ اصرار دو خوبصورت نظمیں لکھوائیں۔ جامعہ ملیہ اور دوسرے اسکولوں سے بچوں اور نوجوانوں کو اکٹھا کیا اور اتنا خوبصورت پروگرام مرتب کیا کہ آج تک پھر کبھی نہ ہو پایا۔ اگرچہ اس کی تقلید میں اب بھی ہر سال بچوں کا میلہ ہوتا ہے۔

جامعہ ملیہ کی ڈراما سوسائٹی نے طے کیا کہ "آگرہ بازار" کو شہر کے اسٹیج پر دلی والوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ قدسیہ نے کچھ سازندے اور ایکسپرٹ ملائے، نظیر کی ایک غزل کی دھن سننے اور درست کرنے میں خود اپنا وقت صرف کیا۔ میں بے ذوقوں کی طرح یا من میٹھی سب سنتی رہتی تھی، مگر قدسیہ مطمئن نہ ہوتی تھیں۔ آخر جامعہ کے ایک نوجوان نے کہا اچھا لو اب تال سُر سے الگ ہو کر فقیر کی لحن مجھ سے سن لیجیے۔ خوش آواز نوجوان نے پہلا مصرع پڑھا تھا کہ قدسیہ پھڑک گئیں۔ موسیقی کے ماہرین بھی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکے۔ اور مجھے اپنی نااہلیت کا قائل ہو جانا پڑا۔

اسی طرح جامعہ کے یومِ تاسیس پر بچوں کے پارک کا نمونہ سراسر ان کی جدت ان کا مشورہ اور پنڈت جی کی خواہش پر انھوں نے پیش کیا۔ اور اس کے بعد بال بھون بچوں کے پارک وغیرہ دلی اور تقریباً ہر اسٹیٹ میں تیار ہوئے۔

نجی تقریبات اور محفلوں میں وہ خالص ہندستانی بیگم بن کر آیا کرتیں اور جاڑوں میں اکثر زرتار ہلکی روئی والی رضائی اوڑھ لیا کرتی تھیں، جو صرف زنانہ محفلوں کی چیز تھی، مگر انھوں نے مکس پارٹیوں میں بھی اسے مقبول بنا دیا تھا۔

جب شفیق صاحب مرحوم نے بالک ماتا سنٹر کی اسکیم تیار کی تو ان کی مجلسِ شوریٰ میں مسز گاباؔ اور قدسیہ مرحومہ پیش پیش تھیں۔ مسز گابا کا تو صرف مشورہ تھا، مگر قدسیہ نے نٹیا محل کے پہلے بالک ماتا سنٹر کی داغ بیل ڈالنے میں پورا ہاتھ بٹایا۔

کتابوں، کہانیوں اور بچوں کی دلچسپیوں میں بھی ان کی مہارت ظاہر ہوئی۔ انھوں نے خود گاندھی بابا کی کہانی لکھی، کتابیں منتخب کیں بھیوری شفیق بھائی کی سہی، مگر سارا پریکٹیکل ورک قدسیہ کے ذمے رہا۔ فرنیچر کے رنگ، ڈیزائن، نرسری کی ضرورت کی خریداری انھیں کے سپرد ہوئی۔ اور چند دن بعد ایک خوبصورت چھوٹا سا سنٹر عوامی سطح کے بچوں کے لیے نظر کے سامنے تھا۔ اس سلسلے میں انھیں روز ہی ٹیا محل کے چکر لگانے پڑے یہ ٹیچرس کی نگرانی اور دیکھ بھال کا سلسلہ بھی ہفتوں جاری رہا۔

ایک سنٹر کی کامیابی دیکھ کر دوسرا اور تیسرا بھی شفیق صاحب نے کھول دیا۔ کیونکہ وہ کستور با ٹرسٹ کی بال واڑی سے اونچا اور مانٹیسوری سے نیچا اسکول لوئر مڈل اور مڈل کلاس کے لیے پیش کرنا چاہتے تھے اور یہ ناممکن ہو جاتا اگر قدسیہ سو فیصدی مددگار نہ بن گئی ہوتیں، سستی اور خوبصورت اشیا کی خریداری میں قدسیہ نے چار چاند لگا دیے۔

اپنے رئیسانہ انداز و مزاج کے باوجود انھوں نے متوسط طبقے میں اس کو مقبول بنانے کے لیے صدیقہ مرحومہ (بیگم شفیق) کا اور میرا ساتھ ڈھونڈھا۔ اور ماؤں سے راہ و رسم بڑھا کر بچوں کو بیگم شفیق کی سپردگی میں دے دیا۔ لیکن یہ سب ہو جانے کے بعد انھوں نے کبھی نہیں کہا کہ یہ سب میرا کیا دھرا ہے۔

مجھے یاد ہے شفیق صاحب سخت بیمار اسپتال میں داخل تھے۔ تعلیم و ترقی کی بلڈنگ ادھوری پڑی تھی۔ ساٹھ ستر ہزار کے بل باقی پڑے تھے، کارکن پریشان تھے۔ برکت علی فراق مرحوم ہم دونوں سے ملے اور بتایا کہ شفیق بھائی کو بیماری میں ان تقاضوں سے بہت تکلیف ہے۔ اپنی صحت سے ناامید ہیں اور انھیں نہیں معلوم یہ بل کیسے ادا ہوں گے۔ اچھے ہوتے تو کوئی صورت کرتے۔

ہم نے طے کیا کہ چلو پنڈت جی کو یہ مشکل بتا آئیں۔ وہی اس کا حل نکالیں گے۔ ملاقات کا وقت مقرر ہوا اور قدسیہ اور میں ان کے آفس پہنچے۔ قدسیہ نے بتایا "وہ کام جو شہر میں ہو رہے ہیں، ان کا ہیڈ آفس شفیق صاحب جامعہ میں بنوا رہے

تھے، تعلیم و ترقی کی اس بلڈنگ میں اڈلٹ ایجوکیشن، بچوں کی برادری، بالک ماتا سنٹر، رسالہ تعلیم و ترقی سب ہی کام ہوتے تھے، مگر وہ سخت بیمار اور مایوس ہیں، ہزاروں کے بل پڑے ہوئے ہیں اور تقریباً اسی ہزار روپیہ واجب الادا ہے۔ اس مشکل سے سوا آپ کے کون نکال سکتا ہے۔

پہلے تو پنڈت جی خاموش سنتے رہے۔ پھر اک دم بپھر گئے، کہنے لگے "پیسہ پاس نہیں اور اتنا بڑا کام شروع کر دیا، جامعہ سے اچھے کام کرنے والے سارے ملک میں نہیں ہیں، مگر بزنس سنس چھو نہیں گیا ہے۔ خرچ کر لیتے ہیں بلا سوچے سمجھے!"

ان کے غصے نے تو ہمارے حواس گم کر دیے۔ قدسیہ نے ہمت کر کے کہا "ناز نازبرداروں ہی سے کیا جاتا ہے۔ آپ کے بھروسے پر انھوں نے کر لیا ہوگا!"

اتنا کہنا تھا کہ اور بگڑے "میرے بھروسے پر۔ میں کیا کر سکتا ہوں"۔ قدسیہ نے کہا "آپ ہی نے تو ان کی عادتیں خراب کی ہیں!" ہم ساکت، پنڈت جی برہم۔ کچھ دیر بعد ذرا ٹھنڈے پڑے تو قدسیہ نے کہا: "ہم تو بڑی امید لے کر آپ کے پاس آئے ہیں"۔ چلو اور ٹھنڈے ہوئے۔ کچھ سوچ کر بولے "اچھا بھئی میرے کمرے میں مولانا آزاد آنے والے ہیں، میں ان سے بات کروں گا"۔

ملاقات ختم ہو گئی ہم دونوں جلدی سے اٹھ پڑے۔ قدسیہ نے اپنا ٹھنڈا برف جیسا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ اور ہم نے جا کر شفیق بھائی کو اپنی کارکردگی سنادی۔ دوسرے تیسرے دن ساری رقم منظور ہو گئی۔

شعرا، آرٹسٹ، سوشل ورکر اور چھوٹے تعلیمی کام کرنے والے بے تکلف ان سے اپنی مشکلات کا ذکر کرتے۔ اور وہ اپنے وسیع حلقۂ احباب میں ان کی دشواریوں کا حل ڈھونڈھ لیا کرتی تھیں۔

۱۹۴۸ء سے لے کر ۷۰ء تک ہمارے تعلقات عجیب قسم کے رہے۔ کبھی بہت زیادہ اور روزانہ ملاقات کبھی اپنی مصروفیتوں کے باعث مہینوں ایک دوسرے کی خیر خبر نہیں۔ لیکن جب بھی ملتیں خوردی و بزرگی کا احترام ملحوظ رکھتی ہوئی اتنی سادگی و پرکاری

کے ساتھ کہ بے اختیار پیار کرنے کو جی چاہتا۔

جس طرح زندگی میں انھوں نے کبھی پریشانی، مایوسی اور ناامیدی کا اظہار نہیں کیا تھا، مرتے وقت بھی اپنے مرض اور حالت کا صحیح اندازہ کر کے ڈاکٹر کو بلانے کو کہا ضرور مگر زیدی صاحب کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر پورے سکون کے ساتھ جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ زیدی صاحب کے علی گڑھ جانے کے بعد بہت روز سے ملاقات بھی نہ ہوئی تھی۔ خبر سن کر علی گڑھ گئی۔ دوستوں کے دل زخمی ہوئے اور آنکھیں اشک بار، گھر کی ویرانی زیدی صاحب کی پوری زندگی پر اثر انداز ہوئی، لیکن حسن شعر اور نغمے کا تصور قدسیہ کی یاد کے ساتھ ہمیشہ کے لیے وابستہ ہو گیا۔

مٹی کے ڈھیر پر پھولوں کا انبار دیکھ کر ایسا لگا
سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں

اور

ایک غنچے کے مسکرانے سے    ایک گل کا مآل یاد آیا

# تم زندہ ہو

عصمت چغتائی

قدسیہ زیدی کی شخصیت کو قلم کی گرفت میں لینا اتنا ہی دشوار ہے جتنا سوئی کے ناکے میں ایک اژدہا کو پرونا۔ میں نے ان کو بہت دور سے بھی اور بہت قریب سے بھی دیکھا اور ہر بار ایک نیا رنگ، نیا رُخ نظر آیا۔ جب ہنستی تھیں تو سر سے پیر تک ہنس پڑتی تھیں جیسے ہارسنگھار کے پھولوں کی پھوار، نہ جانے کیوں سمرقند اور بخارا کے شفتالو کے شگوفے یاد آجاتے تھے اور کبھی جو بے پناہ غصہ آگیا تو کوڑیالے سانپ کی پھنکاریں سنائی دینے لگتی تھیں۔ جھلمل مسکراتی آنکھوں میں چنگاریاں چٹخنے لگتی تھیں۔

مجھے چہرہ دیکھ کر انسان کو جاننے میں بڑا لطف آتا ہے۔ قدسیہ کو دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے پُل صراط یاد آجاتا تھا، بال سے زیادہ باریک تلوار سے زیادہ دھار دار — سوائے سچائی کے کچھ نہ گذر پائے۔

پہلی بار میں نے انھیں حمید بھائی کے ہاں دیکھا تھا۔ جب میں داخل ہوئی تو وہ کچھ اپنی بیٹی شمع کو پھٹکار رہی تھیں۔ شمع تھوڑی دور سخت تنتنائی سی، پھولا منھ پھیرے بیٹھی تھی۔ میرے جاتے ہی ایکدم موسم بدل گیا، اور قدسیہ مجسم گلزار بن گئیں۔ ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد پھر شمع کا دکھڑا سر اٹھانے لگا۔

"بڑی خود سر ہے" خالہ اماں نے چپکے سے میرے کان میں پھونکا۔

"اے ہے قدسیہ کی بیٹی تو لگتی نہیں۔"

"یہی نبانی قدسیہ ہے۔ میں نے فیصلہ کیا۔"

"اے توبہ کرو، اتنی کالی کلوٹی۔"

"سانولی سلونی ہے۔"

"اے خاک نہیں۔ تم تو ہمیشہ الٹی باتیں کرتی ہو۔ ناک تو دیکھو۔"

"ابھی تو بڑھوار کے دن ہیں۔ بڑی سجیلی نکلے گی۔"

"اے مٹو۔ اوپر سے دیوانے پڑے۔ اللہ جانے کیا ہو تا ہے۔"

میں نے اس وقت قدسیہ کے چہرے پر روشن مامتا، اپنے شاہکار پر فخر اور دنیا کے رویہ کا دھڑکا اجاگر دیکھا۔ بیگموں کی رائے تھی میاں نے بیگم کو سر پر چڑھا رکھا ہے۔ کھلی چھوٹ دے دی ہے۔

اے بھلا موئے ڈراموں میں سر کھپانے سے فائدہ۔ بھلی بی بیوں کو تو زیادہ سے زیادہ چھالیہ کتر لینی چاہیے بہت ہوا تو کبھی بیڑا لگا لیا۔ اور لڑکی ذات کو تو دبا کر رکھا جائے نہیں تو بس پھوٹے کرم۔

اصل بات یہ تھی کہ قدسیہ کو ہر قسم کے انسانوں کے نمٹنے کا گر آتا تھا۔ ہر ایک کی فکر میں گھلی جاتی تھیں۔ اور تو اور نیاز حیدر جیسے ٹیڑھے میڑھے عجائب روزگار قسم کے انسان کا کلیان کرنے پر اُتارو ہو گئیں۔ اس کے غم میں ایسی گھلی جاتیں کہ جی جلنے لگتا۔ وہ اندھیرے میں روشنی کی کرن کی تلاش کر لیتی تھیں۔ آج اگر نیاز حیدر زندہ اور پائندہ ہیں اس میں قدسیہ کا بڑا ہاتھ ہے۔ وہ جس ممکن یا ناممکن کام پر جُٹ جاتیں پھر اسے پورا کیے بغیر انھیں نیند نہ آتی۔ جو محبت وہ چاروں کھونٹ بانٹنے کی کشاکش میں لگی رہتیں وہ خود انھوں نے اپنی ذات اور اپنی اولاد کو دینے کی ضرورت نہ سمجھی۔ انھیں تو بہت کچھ ملا ہوا تھا۔ بلکہ زیادہ ہی ملا ہوا تھا۔ سب سے بڑی دولت تو ان بچوں کے فراخدل والدین ہی بڑی نعمت ہوتے ہیں، جو اولاد کو اپنے بنائے ہوئے راستے پر نہیں گھسیٹتے۔ انھیں مکمل آزادی اور اپنے مستقبل کی ذمہ داری سونپ دیتے ہیں۔

کروڑپتیوں کی بیٹیاں بہو بنا کر لانا اور موٹا داماد گھیرنا انھوں نے کبھی ضروری نہ سمجھا۔ ان کے بچّوں نے اپنا مستقبل خود ہی چمکایا۔ والدین کے وسیلہ سے نہیں خود اپنی ذہانت سے۔ دنیا میں مستقبل بنانے کی اولاد کو اجازت دینا ہی اصل روشن خیالی ہے۔

قدسیہ کو ڈراموں سے بے انتہا دلچسپی تھی۔ انھوں نے جو ڈرامے اپنائے وہ ادب میں گرانقدر اضافہ ثابت ہوئے۔ موت کے ظالم ہاتھوں نے انھیں مہلت نہ دی۔ یہ مرنے کے دن نہ تھے۔ اتنی بے چین، اتنی زندہ قدسیہ کا موت سے حوالہ دیتے بھی وہم آتا ہے۔

آخری بار میں نے انھیں کرنل ناصر کی آمد پر علی گڑھ میں دیکھا تھا۔ قدسیہ کا چہرہ گل انار کی طرح جگمگا رہا تھا۔ کپڑے وہ ہمیشہ سادہ ہی سا پہنتی تھیں۔ ان کا چہرہ ان کا سب سے اہم زیور تھا۔ مجھے ان کا کوئی زیور یاد نہیں۔ ہلکے کاسنی دوپٹے میں ان کا چہرہ کچھ کاسنی سا لگ رہا تھا، آنکھوں میں سُرخ ڈورے۔ جب ان کے اچانک دل کے ہاتھوں انتقال کی خبر ملی تو مجھے کاسنی دوپٹے میں کھلا ہوا کاسنی چہرہ یاد آ گیا۔ وہ دل کی مریض تھیں کسی کو شبہہ بھی نہ ہوتا تھا کہ اتنی زندہ، اتنی بے کل بے چین ہستی کے پاس کوئی مرض بھی پھٹک سکتا ہے۔

ان چند ہستیوں میں جنھوں نے مجھے متاثر کیا جن سے مل کر ہمیشہ کچھ پانے کا احساس ہوا، قدسیہ کا شمار ان میں ہے۔

ایک اچھی گھرستن، اولاد کی بہترین دوست، شوہر کی چہیتی قدسیہ۔ کون کہتا ہے تم زندہ نہیں ہو؟

آج برسوں بعد بھی بہت پاس بہت اپنی لگ رہی ہو۔

# بیادِ قدسیہ زیدی

حکیم میرن دہلوی

یاد وہ آئیں تو ہے اشکوں سے اب تر دامن
بادلِ پاک شریکِ غمِ زیدی میرن

اس وقت ہمارے مل بیٹھنے کا سبب ایک ایسی خاتون کی یاد ہے جس کے ایصالِ ثواب کے لیے ہم جمع ہوئے ہیں۔ یہ کون خاتون تھیں؟۔ یہ بیگم قدسیہ زیدی مرحومہ تھیں، جنھوں نے دنیا کی تمام رسمی نزاکتوں کو پسِ پشت ڈال دیا تھا اور ایک صنفِ آہن بن کر ۱۹۴۷ء کے عرصۂ کارزار کا مردانہ وار مقابلہ کیا تھا۔

آیئے اب ذرا ہم ۳۳/۳۴ سال پہلے کے واقعات کا جائزہ لیں، جس میں ۷ ستمبر جمعرات کے روز شہرِ دلی پر ایک عذاب منجانب اللہ نہیں، بلکہ منجانب بندگانِ خدا نازل ہوا تھا۔ اس ہولناک منظر کو یاد کر کے آج بھی حساس قلوب تھرا اٹھتے ہیں۔

وقت کی تنگی کا لحاظ کرتے ہوئے تفصیل میں جانا نہیں چاہتا۔ صرف چند واقعات پہ اکتفا کرونگا۔

ستمبر ۱۹۴۷ء کی آخری تاریخ تھی۔ اُن دنوں میں ہمدرد دواخانے کی شاخ چتلی قبر پر انچارج طبیب تھا۔ اس زمانے میں میرا معمول تھا کہ ۱۲ بجے مطب سے فارغ ہو کر جہاں تک وقت ملتا میں پیدل گھوما کرتا تھا۔ اپنے بارے میں مجھے کامل یقین ہو گیا تھا کہ میری موت اس طرح نہ آئے گی۔ حال آنکہ شہر کے چپّوں میں

میرے سامنے تین چار ایسے واقعات ہو چکے تھے کہ جن میں میرے ساتھ کے لوگوں میں کبھی کوئی اگلا یا درمیانی یا پچھلا شخص ایک گلی سے بھاگتے ہوئے شخص کے خنجر کے وار سے سڑک پر گر کر دم توڑ چکا تھا۔ میں نے خیال کیا کہ ان پچھلے یا درمیانی اشخاص میں، میں کیوں نہ ہوا! خیر، اسی طرح ایک دن ۱۲ بجے کے بعد میں ترکمان گیٹ منٹو برج کے پل سے نکلا اور پیدل نئی دلّی کے حدود میں داخل ہوگیا۔ میرا جامعہ ملیہ اوکھلا آنے کا قصد تھا۔

غالباً یہ تلک مارگ یا کوئی اور چوراہا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ قدسیہ زیدی چلی آرہی ہیں۔ کچھ لڑکے، لڑکیاں، بچے اور ایک بوڑھی عورت ان کے ساتھ ہیں۔ ساری میلی، بال پریشان، چہرہ تکان سے پژمردہ۔ وہ گود میں کچھ چیزیں لیے لنگڑاتی آرہی تھیں۔ میں نے بڑھ کے دریافت کیا بیگم صاحبہ آپ کہاں سے آرہی ہیں؟ جواب دیا، حوض خاص، چراغ دلّی وغیرہ سے آرہی ہوں۔ کچھ دور چلنے کے بعد دیکھا کہ ایک جیپ میں علی گڑھ کی بال برادری والے قیصر نقوی اور رشاید سبھدرا جوشی تھیں۔ اس جیپ میں بیٹھ کر سب ایک سمت روانہ ہوگئے۔ مجھ سے بھی ساتھ چلنے کو کہا، لیکن مجھے اوکھلے آنا تھا، اس لیے میں ان کے ساتھ نہ جا سکا۔ چلتے چلتے سب کو ایک ایک سنترہ دے کر یہ قافلہ روانہ ہوگیا۔ وہ کہاں گیا کچھ پتا نہیں۔

بعد میں معلوم ہوا کہ مرحومہ کا اس ہنگامہ میں صبح سے شام تک کا یہی معمول تھا۔ میں اس وقت تک قدسیہ زیدی سے زیادہ مانوس نہ تھا۔ تاہم اس واقعے سے بہت متاثر ہوا۔

اس کے بعد ایک زمانے میں زیدی صاحب جامعہ نگر میں موجودہ عابد ولا کے پاس ہی ٹیپو محل میں مقیم تھے۔ بیگم زیدی بھی یہیں تھیں۔ ایک دن میں گھومتا

ہوا ذرا دور سے آرہا تھا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ٹیپو محل کے سامنے کے میدان میں بیگم ذاکر حسین کی بکریاں اور بھیڑیں اور گائیں چر رہی تھیں۔ یکبارگی نہ معلوم یہ سب کس وجہ سے بھاگیں۔ چونکہ عابد ولا قریب تھا، میری بچی نزہت مہدی اور اس کی سہیلیاں کونے پر کھیل رہی تھیں۔ وہ ان بکریوں، گایوں کے بیچ میں پھنس گئیں قدرتاً وہ بہت ڈریں اور چیخ چیخ کر رونے لگیں۔ دیکھتا کیا ہوں کہ بیگم زیدی اپنے گھر سے بے تحاشا ننگے پاؤں دوڑتی آرہی ہیں۔ انھیں دہلیز پر ٹھوکر لگی اور انگوٹھا زخمی ہوا۔ لیکن اسی حال میں انھوں نے نزہت کو گود میں لے لیا اور دوسری بچیوں کے ہاتھ پکڑے میرے گھر لے آئیں۔ اتنی دیر میں، میں بھی دوڑ کے پہنچا۔ بیگم صاحبہ میرے گھر میں داخل ہو چکی تھیں۔ وہ بری طرح ہانپ رہی تھیں۔ لیکن انھیں انگوٹھے کی چوٹ کی مطلق پروا نہ تھی۔ بچیوں کو سپرد کر کے میری بیوی پر خفا ہوئیں، مجھ پر ناراض ہوئیں کہ بچیوں کو اس طرح جانوروں کے درمیان کھیلنے کی اجازت دی گئی تھی، اتنا کہا اور چلی گئیں۔

ایک روز وہ گھر سے نکلیں۔ اطہر پرویز صاحب جو آج کل علی گڑھ میں ہیں ساتھ تھے، میں بھی ساتھ ہو گیا۔ رستے میں ایک بوڑھا ملا، جو بیٹھا کھانس رہا تھا غالباً اس کو دمے کی شکایت تھی۔ اس کا دم پھول رہا تھا۔ بیگم صاحبہ اس جگہ ٹھہر گئیں اور اس بوڑھے کو ساتھ لے کر اپنی کوٹھی پر آئیں۔ ہم دونوں بھی ساتھ تھے۔ اس شخص کو بٹھایا، خود ہی جا کر کافی تیار کر کے لائیں، اس کو اور ہم دونوں کو پلائی پھر اس بوڑھے کا حال پوچھا اور اسے کچھ روپے دے کر ڈاکٹر کا پتا بتایا، خط دیا اور فرمایا کہ اس ڈاکٹر سے علاج کراؤ اور مجھ سے ملتے رہو۔ جب وہ چلا گیا تو ہم دونوں نے پوچھا یہ کون شخص تھا: فرمایا کہ یہ دھوبی معلوم ہوتا ہے میں نے دریافت کیا آپ نے کیسے پہچانا؟ فرمایا کہ اس کے پیر گھٹنوں تک سفید ہیں اور کہنیوں تک

ہاتھوں میں جھرّیاں پڑ گئی ہیں، اس سے مجھے اندازہ ہوا۔ بعد میں ان کا یہ اندازہ صحیح نکلا۔

یہ تھیں وہ خاتون۔ میں ان تین ہی واقعات پر اکتفا کرتا ہوں۔ ورنہ بہتیرے واقعات اور بھی ہیں۔ غور کا مقام ہے کہ کیا ایسی ہستیوں کے لیے صرف مروّجہ رسمیں باعثِ سکونِ روح ہو سکتی ہیں!

صنفِ نازک ہوتے ہوئے شمعِ انجمن تو ماشاء اللہ بہت خواتین مل جائینگی مگر اس کارزارِ ہستی میں صنفِ نازک آہنی صنف بن کر کیا کچھ کر سکنے کی صلاحیت رکھتی ہے، ہندستان میں چراغ لے کے ڈھونڈھنے سے بھی کم ملیں گی، ہاں مغربی ممالک میں ممکن ہے کہ ایسی مثالیں مل جائیں۔

اسی اوکھلے کی مختصر آبادی میں بہت سے تعلیمی ادارے ہیں اس کے باوجود بہت سے غریب بچے ایسے ہیں جو اپنے فاضل وقت میں گلی کوچوں میں مارے مارے پھرتے ہیں، اور بُری عادتیں اختیار کر لیتے ہیں۔ کیا ان غریبوں کے لیے فلاح کی کوئی تدبیر ہو سکتی ہے! محترم زیدی صاحب مدظلہ عمر کی اس منزل پر پہنچنے کے بعد بھی جوان ہمّت ہیں، کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہتے ہیں اور تاحیات انشاء اللہ کرتے ہی رہینگے۔

# پیغاماتِ تعزیت

# ڈاکٹر ذاکر حسین خان

برادر غم نصیب زیدی صاحب

ابھی ابھی جمشید پور سے لوٹا تو مرید صاحب کا تار ملا کہ قدسیہ زیدی بھی ساتھ چھوڑ گئیں۔ کیا لکھوں آپ کو اور کیسے لکھوں۔ اس دس منٹ میں جو خبر پا کر گزر رہے نہ جانے کیا کیا آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ نہ جانے کب تک کیا کیا یاد آتا رہے گا۔ مگر وہ تو چلی گئیں۔ اب دیکھیں کب ملاقات ہو۔ آپ پر جو گزر گئی اور گزر رہی ہوگی اس کا اندازہ کون لگا سکے گا۔ جانتا ہوں کہ آپ کی صبر کی خو اور راضی برضا رہنے کا مسلک اس ابتلائے عظیم میں بھی آپ کا ساتھ دیں گے مگر جی کی بستی تو سونی ہو ہی گئی

شمع، سید اور بلال اپنی اپنی جگہ تڑپ رہے ہوں گے۔ ابھی دو دن ہوئے آپ کا خط آیا تھا۔ کس وقت جواب لکھا۔ اب اسے کیا لکھوں؟ اور اس وقت آپ کو بھی اور کیا لکھوں جس نے یہ غم کا پہاڑ آپ پر توڑا ہے وہی اس کے اٹھانے کی طاقت بھی عطا فرمائے۔

آپ کا شریکِ غم بھائی
ذاکر

# جگن ناتھ آزاد

محترم و مکرم قبلہ زیدی صاحب تسلیم!

پرسوں ایک طویل غیر حاضری کے بعد دہلی واپس آیا تو بیگم زیدی صاحبہ کے انتقال پُرملال کی خبر سنی۔ احساس پر گویا بجلی سی گری۔ بیان نہیں کر سکتا کہ دل و دماغ کی کیا کیفیت ہوئی۔ اس وقت تک اس اندوہناک خبر کا یقین نہیں آرہا۔ ان دنوں میں کئی بار تار یا خط کے ذریعے سے تعزیت کرنی چاہی لیکن یقین مانیے جیسے کسی نے ہاتھ جکڑ لیے ہوں۔ وہ مسکراتا ہوا چہرہ اس وقت نظر کے سامنے ہے اور میں حیران ہوں کہ کن الفاظ میں آپ سے اظہار تعزیت کروں۔ آپ کے غم و اندوہ کا اندازہ کرنا میرے بس میں نہیں۔

گذشتہ چودہ برس میں کتنی ہی بار میری ان سے ملاقات ہوئی۔ کتنی ہی بار مجھے ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا۔ دہلی میں بھی اور علی گڑھ میں بھی۔ ہر ملاقات میں ان کی عظمت کا نقش مجھ پر اور گہرا ہوتا چلا گیا۔

دہلی کی سماجی سرگرمیوں میں ان کی مشغولیت شعرا کے ساتھ ان کے مشفقانہ مراسم، بچوں کے لیے اُن کے کام نہ جانے کس کس ماحول میں خلا پیدا ہو گیا ہے۔

دعا ہے کہ خدائے کریم مرحومہ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور آپ کو اور بچوں کو صبر جمیل عطا کرے۔

شریک غم

# راج بہادر گوڑ

مکرمی زیدی صاحب تسلیمات

آپ کو کس منہ سے نئے سال کی بات کہوں، پرانے سال نے آپ پر مصیبت کے پہاڑ توڑے ہیں۔ بیگم قدسیہ زیدی کے انتقال پر ملال کی کیفیت یہاں حیدرآباد پہنچنے پر ملی۔ شدید رنج ہوا۔ بیگم صاحبہ سے جو دہلی میں جو سرسری ملاقاتیں ہوتی رہیں ہیں وہ آنکھوں کے سامنے گھومنے لگیں۔

اور آپ کے لیے تو وہ رفیقہ حیات ہی نہیں رفیقہ کار حیات بھی تو تھیں۔ آپ کے رنج و محن کا محض اندازہ ہی لگا سکتا ہوں اور آج بھی شاید مشکل سے ہندستان کی تہذیبی کارکنوں میں بیگم صاحبہ کا اپنا مقام تھا۔ میری طرف سے دلی تعزیت قبول فرمائیے۔

نیاز مند

# دیوان سنگھ مفتون

محترم

بیگم صاحبہ زیدی کے انتقال کی خبر پڑھ کر افسوس ہوا خدا آپ کو صبر کی توفیق عطا کرے۔

# محمد حفظ الرحمٰن

مکرم و محترم زیدی صاحب زاد عنایتکم

السلام علیکم

مزاج گرامی

محترمہ قدسیہ مرحومہ کی تعزیت کن الفاظ میں ادا کروں ہمت نہیں ہوتی۔ یہ حادثہ جانکاہ ذاتی طور پر آپ کے لیے تنہا ناقابل برداشت صدمہ نہیں ہے بلکہ ہندستان کی ادبی اور معاشرتی زندگی کا ایک جانفرسا حادثہ ہے۔ محترمہ مرحومہ نے اس مختصر سی عمر میں زندگی کا جو انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیت میں ثبوت دیا ہے وہ مشرقی عورتوں کے لیے عموماً اور مسلمان عورتوں کے لیے خصوصاً ایک بے نظیر مثال ہے۔ اپنے شوہر کی جان نثار بیوی اور بچوں کی غمگسار ماں اور اس کے ساتھ ساتھ معاشرتی سماجی ادبی خدمات میں یکسانیت کے ساتھ خدمت گذار ثابت ہوئیں۔ اس لیے ان کا صدمہ تنہا آپ کا صدمہ نہیں ہے ہمارا اور سب وطن دوست انسانوں کا صدمہ ہے۔ تاہم انسان فانی ہے اور اس دنیا میں پیغمبر اور پیغمبر زادوں سب ہی نے موت کا ذائقہ چکھا ہے اور سب کو چکھنا ہے' اس لیے اسلام نے پہلے ہی وقت میں رضا بقضائے الہٰی اور صبر مرد مومن کی بہت بڑی نشانی رسول پاک نے ارشاد فرمایا ہے۔ الصبر عند الصدمۃ الاولیٰ۔ یعنی حقیقی صبر وہی ہے جو صدمہ کی پہلی ہی چوٹ پر اختیار کیا جائے ورنہ آخر میں تو سب ہی صبر کرتے ہیں۔ حق تعالیٰ کی بارگاہ میں دست بدعا ہوں کہ قدسیہ مرحومہ کو فردوسِ اعلیٰ عطا فرمائے اور آپ کو' بچوں اور عزیزوں کو اور ہم سب کو صبر جمیل کی توفیق بخشے۔

آج میں بھاؤ نگر جا رہا ہوں غالباً ایک ہفتے میں واپسی ہوگی۔ والسلام

آپ کا مخلص

# اشکِ عقیدت

## بیادِ جنّت مکان خلد آشیاں قُدسیہ زیدی مرحومہ

عرشی بلرامپوریؔ

سرگرمِ ذکرِ خیر ہے جوشِ نوائے حق
آئینہ دارِ نطق ہے جلوہ نمائے حق

کوثر بہ لب ہے طیبؔ طاہر ثنائے حق
اللہ رے کرم، کہ ہے گویا رضائے حق

قدسیوں کی صف میں ہے نعرہ درود کا
منظور قدسیہ کی ہے سیرت کا تذکرہ

وہ قدسیہ، کنیزیِ زہرا پہ افتخار
وہ مومنہ منازلِ ایمان برقرار

وہ عابدہ، مدارجِ ارکانِ حق گزار
وہ صالحہ، بلندیِ اخلاق و انکسار

ایتام و بیوگان کا ہر لحظہ پاس تھا
احساسِ آہ و درد و فغاں بے قیاس تھا

وقتِ عزائے شاہِ شہیدانِ کربلا
ہستی کی فکر تھی نہ سراپا کا ہوش تھا

وہ مجلسِ امامِ دو عالم، وہ مرثیہ
وہ بے پناہ ماتمِ مظلوم، وہ بکا

وہ سیلِ اشکِ ذکرِ فداکارِ حسین
معمول تھا وطن میں عزاداریِ حسین

ایثار و فیض و علم و ادب کا مجسمہ
نامِ حسین (ع) دل کی نگاہوں کا آئینہ

انجامِ زیست حُبِّ محمد پہ خاتمہ
ظلِ نجات سایۂ دامانِ فاطمہ

اے قدسیہ شفیعۂ محشر کا ساتھ ہے
جنت ہے کیا رضائے خدا تیرے ہاتھ ہے

آساں نہیں ہے قدسیہ زیدی کا ماجرا
سعیِ رفاہِ خلق کا اک باب ہے جدا

ذکرِ الٰہ، بابِ اطاعت ہے دوسرا
عرشی مگر ٹھہر، کہ ہے یہ موقفِ دعا

آرامگاہِ خلدِ بریں، ربِّ مشرقین!
دے اپنی اس کنیز کو بہرِ غمِ حسینؑ

۲۷ر دسمبر سنہ ۱۹۶۱ء چہار شنبہ علی گڑھ

# قدسیہ بھابی کی یاد میں

آل احمد سرور

شمع جلتی رہی، پھول کھلتے رہے
بام و در نور سے جگمگاتے رہے

روشنی لینے پروانے آتے رہے
اپنے سینوں کو ایمن بناتے رہے

رنگ کے قافلے، نور کے دائرے
رات کی گود کرنوں سے بھرتے رہے

مست تھے جو قدم تیز ہوتے رہے
راہرو اپنی منزل کو جاتے رہے

شمع جلتی رہی اور پگھلتی رہی
رات ڈھلتی رہی رقص ہوتا رہا

کتنے ٹوٹے ہوئے ساز بجتے رہے
کتنے خاموش لب، گنگناتے رہے

روشنی کے دلوں کے کنول کھل گئے
بے سہاروں کو کچھ آسرے مل گئے

قطرے دریا کو آنکھیں دکھاتے رہے
ذرّے سورج سے آنکھیں ملاتے رہے

یک بیک کیا ہوا شمع گل ہو گئی
موت نے زندگی سے چمک چھین لی

شوق کے مرحلے، لطف کے سلسلے
زیست کے ہمہمے یاد آتے رہے

## قطعۂ تاریخ

بانوئے آقائے من والائے من کرنل بشیر
پاک طینت نیک خو فرخ لقا عفت سرشت

روز سہ شنبہ بوقت صبح از ماہ رجب
رہ گرا گردید در ہفتم سوئے باغ بہشت

در غمش بر داشت جعفر دل ز دہر سال فوت
بر مزارش مرقد و پاک قدسیہ بیگم نوشت

میرزا جعفر حسین قزلباش ۱۳۸۰ھ

# چچی جان کی یاد میں

ساجدہ زیدی

فضا تاریک کیوں تاروں میں کم کم روشنی کیوں ہے
یہ دل کے ساز کی آواز مدھم آج ہی کیوں ہے
یہ کس کی روشنی سے ہو گئی محروم یہ محفل ؟
دل اُمیدوں سے اور خوشیوں سے خالی زندگی کیوں ہے؟

یہ گلشن کی فضا میں کون سا گل آج مرجھایا؟
صبا بے کیف کیوں پھولوں پہ یہ افسردگی کیوں ہے؟
کوئی شمع فروزاں بجھ گئی ، اندھیر ہے محفل
گھٹا اندوہ کی اس بزم پر چھائی ہوئی کیوں ہے؟

جو تھی جانِ تمنا ، جانِ محفل ، زینتِ خانہ
نظر اس جانِ میخانہ کی یوں بدلی ہوئی کیوں ہے
دلوں کے درد کا درمان کیوں ملتا نہیں یا رب!
ہر اک مجروح دل پر اور بھی بیچارگی کیوں ہے؟

یہ کیا احساس ہے جو ہر خوشی پگھلی سی جاتی ہے
لبوں کی مسکراہٹ میں بھی یہ پژمردگی کیوں ہے؟

یہ سازِ غم میں کیوں آہنگ دل ملنے لگا یا رب!
یہ لذت غم میں کیوں، اور درد میں آسودگی کیوں ہے؟

یہ کس جانِ وفا نے توڑ ڈالا رشتۂ الفت
رہ و رسمِ وفا اس دہر میں بدلی ہوئی کیوں ہے؟

یہ کس احساس سے دل کی دھڑکنیں خاموش ہوتی ہیں
یہ احساسِ رواں کی آنکھ میں شرمندگی کیوں ہے؟

بہار آئی ہے سالِ نو کی آمد ہے مگر پھر بھی
غمِ دل مرتعش کیوں، زندگی ٹھہری ہوئی کیوں ہے

# تاثراتِ قلب

مولانا حفیظ الرحمان خاں مجیبی

طوطیِ شکر فشاں، شیریں دہاں رطب اللساں — حق تعالیٰ نے تجھے بخشا تھا نطق گلفشاں
یاد ہی کرتے رہیں گے تجھ کو تیرے مدح خواں — الوداع اے دردمند و غمگسارِ بیکساں
کنجِ مرقد میں دریچے باغِ جنت کے کھلیں — نیکیاں جو ساتھ ہیں گلہائے رحمت میں تلیں

(۲)

تھیں یگانہ اور مشہورِ زمانہ ہو گئیں — چند لمحوں میں حقیقت سے فسانہ ہو گئیں
عجلتِ دستِ قضا نے بھی سہارا دے دیا — قدسیہ زیدی سوئے جنت روانہ ہو گئیں

(۳)

نہادہ ام سرِ تعظیم قدسیہ زیدی — یہ خاکِ پاک تو تسلیم قدسیہ زیدی
حفیظ خونِ دل از غم رسید تا مژگاں — حیات و مرگ چہ ترتیم قدسیہ زیدی
صفاتِ ذاتِ مقدس بہ ہر زباں جاری — کہ بود احسنِ تقویم قدسیہ زیدی

م حفیظ کشیدہ بہ فکرِ تاریخش
سرور کوثر و تسنیم قدسیہ زیدی — سنہ ۱۹۶۰ء

(۴)

وہ قدسیہ جو بلبلِ باغِ جناں ہوئیں — یعنی حریمِ قدس میں جلوہ کناں ہوئیں
لکھ دو حفیظ مصرعِ تاریخ عیسوی — اک حور تھیں جو خلدِ بریں کو رواں ہوئیں

سنہ ۱۹۶۰ء

# قطعۂ تاریخ رحلت

## محترمہ قدسیہ زیدی مرحومہ

کہاں وہ اب گل و بلبل کا کاروبار افسوس
چمن سے اٹھ گیا کیا موسم بہار افسوس

یہ کس عروس گلستاں کی ہے جوان مرگی
کہ غم سے پھولوں کے دامن ہیں تار تار افسوس

ہوا ہے سانحہ ایسا کہ شبنم مغموم
چمن میں بیٹھ کے روتی ہے زار زار افسوس

گئیں جہاں سے اچانک جو قدسیہ زیدی
خبر یہ سن کے ہوئے سب کے دل فگار افسوس

ہوئے ہیں شفقت مادر سے تینوں ہی محروم
بلال و شمع و سعید ہیں بیقرار افسوس

وہ اپنی صنف سے اک بے مثال ہستی تھیں
فضائے زیست نہ ہو پائی سازگار افسوس

وہ عام لطف و کرم ان کا اور خدمت خلق
ہیں آج اپنے پرائے بھی اشکبار افسوس

وہ اپنی ذات سے خود انجمن تھیں اک واللہ
ہے ان کے غم میں ہر اک بزم سوگوار افسوس

سفر حیات کا کیوں سخت ہو نہ زیدی پر
بجھا چراغ ہے تاریک رہگزار افسوس

تھی جس کے گھر میں بھی باہر بھی یکساں رونق
وہ محو خواب ہے مستی تہِ مزار افسوس

سنہ وفات یہ میرن نے دل سے لکھا ہے
بہارِ خانۂ زیدی گئی ہزار افسوس

١٣٤٦ / ١٣٨٠ ھ

خاکسار حکیم میرن دہلوی

۱۔ عابد ولا۔ جامعہ نگر، نئی دلی، ۲۵

# BEGUM QUDSIAZAIDI

## K.G. SAIYIDAIN

*I cannot speak of Begum Zaidi objectively and dispassionately because the wound is still too raw. And, in any case, love and affection are not objective. This is, however, a brief and inadequate tribute to a personality of exceptional charm and grace who made her life into a work of art and left her beautiful imprint on so many things.*

What impressed me most about her was the harmonious blending of so many different and disparate qualities which seldom came together in a single person. She was by temperament an artist, with the artist's intensity and sensitiveness, which were reflected in all that she undertook. She was interested in literature, in art and drama, in children's writings and paintings–in fact the whole field of culture and she rendered valuable service to them. But persons with an artistic mind are seldom good executives and admininstrators. Begum Zaidi, however, had the gift of organising things with an efficiency which experienced executives could well envy. She built up the Hindustani Theatre from scratch, wrote and adapted plays, recruited actors, kept them together, solved their many problems from day to day and also made herself responsible for raising the funds. Any of them was nearly a man sized job! Again, this artist–executive had an enormous, almost infinite capacity for helping people of all

ranks and stations– artists, writers, poets, students, refugees, business men, politicians. So many knocked at her door, and once she was convinced that a case was genuine and deserving, she threw herself into it with a vigour and gusto greater than that of the person himself ! Not every one, however, needed to knock. If she saw a person in need or distress, her heart registered the knock and she went out of her way to help him with characteristic generosity and with a considerateness and sopntaneity which made it easy for the most self-respecting recepient. But she was "no body's fool" as good hearted persons often are. You could not easily deceive her. Her intelligence and understanding of men and matters matched her social compassion and she was ready and able to join issue, or match her wits, with seasoned politicians and administrators. She had also great courage, moral as well as intellectual, and usually made no secret of her views to placate persons in power. She could fly into a fit of righteous indignation when the occasion demanded it–a quality which is at serious discount in this age of timidity and compromise.

Persons interested in art have usually little interest in social problems or social service and women social workers often lack domestic and social graces. With all her wide interests and preoccupation, Begum Zaidi was a woman of exceptional charm and social and domestic accomplishments. When she "sailed" into a room, her conversation and personality enlivened the whole group–one had the the feeling that the lights had become brighter! And it was not the stereotyped 'party charm', the switching on of a set smile and an artificial brightness but emanated from her deeper self, her genuine interest in people, her intense humanism. She was interested in all kinds of people-distinguished foreign visitors, struggling poets, artists and writers, down-at-heel students, the brilliant social set in the city and the poor women who lived

in her village. It was an unusual quality – the accomplished and aristocratic lady who brought distinction to the most select parties was equally at home in the company of ignorant, unlettered peasant women who would crowd round her and share their worries with her. And the secret? She treated them all on a footing of equality, as human beings, and was sincerely interested in them......

With all these gifts and achievements, she shunned the lime light scrupulously and seldom appeared on the stage or the platform, preferring to work behind the curtain. The corroding examples of publicity-seeking, which she found all round herself, left her untouched. She found the joy not only of self-fulfilment but also of self-expression in her work.

It has been my good fortune to come into enriching personal contact with several outstanding men and women of great personal qualities. Two of them – both associated with Aligarh curiously – had such a vital and life-giving personality that, somehow, one did not associate the idea of death with them: Sir Ross Masood and Begum Zaidi. And both of them died young when they were in the prime of their life and powers. "All that is on earth will perish but will abide for ever the countenance of thy Lord of great might and glory."

Qudsia Zaidi lived like an intense flame, bringing light and cheer into many hearts and homes. And now she is gone to the Maker, leaving her numerous admirers disconsolate and grief stricken but also with a certain sense of pride and satisfaction that she was a fellow traveller with them on a road which eventually leads every one to the same irrevocable destination.

Death took away Begum Qudsia Zaidi with such suddenness that the sense of loss seems to deepen with the passage of time. Begum Zaidi's personality had so many significant facets that the loss is felt in different ways by different people. A devoted wife, a loving mother, an affectionate friend, an unobtrusive helper of the poor, her memory is treasured by many in varied contexts. But there were some important aspects of her life which make her early death a national loss. Her commitment to excellence, moral and aesthetic, her anxiety to discover talent and to help and encourage it to grow and develop, her passionate attachment to work that flowed from these qualities made her a person of great social significance. This work, in which she would not spare herself, it appears, killed her. And yet that work remains unfinished and waits to be done. Production of good literature for children and the establishment of a national theatre were projects which engaged her most towards the end. This work must be done.

I am glad that her talented daughter, Shama Zaidi and some others who had worked for the Hindustani Theatre under Begum Qudsia Zaidi's inspiration and guidance are trying heroically to keep alive the Hindustani Theatre and all it was to stand for. Their efforts deserve all encouragement and help. I am sure these will be forthcoming in ample measure.

New Delhi
December 4, 1962.

Sd. Zakir Husain

# A FEW OF THE CONDOLENCE MESSAGES RECEIVED

Anand Bhawan,
ALLAHABAD,
December 28, 1960

My dear Zaidi,

I have learnt with a sense of great shock and grief of Qudsia's death. I saw her a few days ago and she was full of life and energy and her mind was full of her various activities. For such a person to be taken away so suddenly shakes one up. If that is the reaction on me, I can well understand what a terrible shock it must be to you. All I can do is to send you my deepest sympathy.

Yours sincerely,
**Jawahar Lal Nehru**

Colonel B.H. Zaidi
Vice-Chancellor, Aligarh University,
Aligarh.

**President Gamal Abdul Nasser**

It is with the deepest affliction that I have learnt of the death of your wife. I would express to you my heartiest condolences and profound sympathy. Pray Almighty God to grant you a long life and protect you from harm.

**Dr. Radhakrishan**

Shocked to read about your wife's sudden death. My deepest sympathy to you and your children in your great bereavememt. Hope you will bear up.

**His Holiness Syedna Tahir Saifuddin Saheb**

Extremely shocked to learn very sad news of Begum Zaidi's sudden demise. Please be assured my deepest sympathy is with you in the bereavement. How wonderfully she helped you in your enormous duties and how cheerfully she associated herself with your problems during these eventful years. May I offer my personal condolences and that of all my family members. I pray that God may give you and your dear children strength to bear this very heavy loss. May Allah keep you in His protection.

**Shri V.V. Giri**

I am terribly shocked to hear the demise of your esteemed wife. The loss is not only personal to you, but a loss to the whole country which is irreparable. Nobody can forget, who came into contact with her, her amiable personality. She was indeed a popular figure in the Capital's social and intellectual life. She had boundless energy and drive and faced difficulties undaunted and secured her objectives. The whole nation mourns her loss. I hope you will take this great calamity with a spirit of resignation.

My wife joins with me in sending her respectful condolences to you.

**Shri F. A. Ahmad**

I was shocked to see from this morning's newspapter about the sad news of your wife's sudden and unexpected death. She was a leading lady in our public life. Her death has caused a void which will be difficult [illegible]

give you any comfort at this time, but we have to bow down to Almighty's will. I have no doubt that you will bear this irreparable loss withpatience and fortitude. Please accept my sincerest condolences for this bereavement.

**Prince Y. Najmuddin**

Very much grieved on Begum Zaidi's sudden passing away. My deepest sympathy and condolences to you, dear children and family on this very distressing calamity. No words at this juncture would convey our feeling of sorrow as personally I had always cherished Begum Saheba's kindness and support to me whenever I needed. Though you have lost a dear wife but Delhi has lost a great social worker, an eminent citizen and a friend of all in distress and in need of help. May God be with you in the bereavement and give you strength for your multifarious duties now to be faced by you without her supporting hand.

**Shri Morarji Desai**

Grieved hear sudden demise of Qudsia Begum. My heartfelt condolences and sympathy in bereavement.

**Shri Lal Bahadur Shastri**

Extremely sorry and grieved. Please accept my most heartfelt sympathy.

**Dr. C.D. Deshmukh**

Shreemati Durgabai and I were distressed beyond words to learn from the papers about your bereavement. We do not know what words of condelence . use in offering you our deepest sympathy and consolation. Human beings cannot understand how it comes about that some of the flower of our society is prematurely carried away by death. Providence alone will give you the fortitude to bear your loss. Our hearts go out to you

**Dr. Tara Chand**

Exceedingly shocked and grieved at sad and premature passing away of Begum Zaidi. Send heartfelt condolences.

**Dr. K. A. Hamied**

I was in my office yesterday when Prince Najmuddin rang me up at about 11 a.m. It was impossible to believe the shocking news he gave me. First I thought there was some mistake but I was wrong.

Words cannot convey the mental distress this calamitous news gave us all. Luba and myself were completely stunned. The suddenness of the tragedy was still more staggering and made the tragedy for more tragic. I tried to contact you on the phone but failed. The telegram I sent could hardly carry the heartrending feeling of grief and sorrow at this irreparable loss.

The ways of God Almighty are inexplicable. He creates and destroys. How and why we human beings are incapable of fathoming. The progress of science and medicine of which man boasts so much is of no value and help. It is on such occasions that man realises his utter insignificance and sheer helplessness and becomes conscious of the existence of all powerful omnipotent God Whose Will is supreme. We are completely helpless and there is, no other alternative but to bow in mute and humble submission to the will of God.

I am fully feeling the pain and anguish you must be passing through. I wanted to come to Aligarh immediately to share and divide your grief but engaged as we are today in wordly affairs I could not free myself to leave Bombay. I shall be coming soon.

I pray to God to give you courage to bear this irreversable loss with patience and fortitude as enjoined by God Almighty in this famous verse from Quran:

وَلنبلونكمُ بشئٍ من الخوف والجوعِ ونقصٍ
من الأموالِ والأنفس والثمرات ۔ وبشر الصابرين
الذين إذا أصابتهم مصيبة قالوا إنالله وإنا إليه
راجعون (أولئک علیٰ ھدیً من الربهم و اولئک
ھم المھتدون ۔)

Luba, Sophie, Yusuf, Muku all join me in our indiscribable feeling of utter mental frustration and grief.

**Khwaja Ahmad Abbas**

I did not believe it at first. It was too shocking to be true. But then the papers confirmed the tragedy. I know (from personal experience) that words can offer no consolation to you. This loss is irreparable. And yet in a sense she is not dead, she will remain alive-her memory, the vibrations of her sweet personality, the impress of her good work, specially in the realm of the theatre. I wish it is possible to keep alive the Hindustani Theatre into which she poured so much of her life-blood. Then, perhaps, we shall be able to pay Our homage to her memory.

Please accept my sincerest consolations. This is not a formal expression, but the shared grief of a son, a brother and a friend.

# قدسیہ زیدی

ISBN: 978-81-7587-936-2

₹ 71/-